غم کی رسی اور خدا

فاطمہ رسول

غم کی رسی اور خدا

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

از قلم فاطمہ رسول

All Rights Reserved

Copyright: Fatima Rasool (Author)

Published by: Safar-e-Adab

Published On: safareadab.com

To get published with us, contact us via email or website:

safareadab.com

khanumaira@safareadab.com

adab@safareadab.com

Note: We don't charge anything to publish online. If anyone charges any kind of fee in order to publish your write-ups in the name of Safar-e-Adab, please don't try to go ahead with them and immediately report them using the contact us button on our website. Thank you

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ضروری بات

غم کی رسی اور خدا کے تمام جملہ حقوق لکھاری "فاطمہ رسول" کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے پلیٹفارم یا سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہوگی۔ بغیر اجازت کہانی کا استعمال کرنے والوں پر سخت کاروائی کی جاسکتی ہے۔

اس کہانی اور اس میں موجود کردار محض تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

قسط نمبر:07

باب نمبر سات

خود غرض!

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

خود غرض،

یہی کہا تھا نا تم نے مجھے ؟

اس اک طلسماتی لمحے میں

جب یکلخت دل بھی ٹوٹا تھا

جب ذہن نے اک عزم سے

اس لفظ کو خود میں سمایا تھا

پھر میں نے کائنات کی ہر شے میں خود کو الجھایا تھا

ہر چیز کو دیکھا غور سے اور پھر اک نتیجہ نکالا تھا

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

خود غرض تو سورج ہوتا ہے

ہر اک کو جلاتا رہتا ہے

خود غرض تو چاند بھی ہوتا ہے

تکبر اپنے حسن پہ کرتا ہے

خود غرض تو بادل ہوتے ہیں

جھونپڑیوں پر بھی برستے ہیں

خود غرض تو تتلی ہوتی ہے

رنگ پھولوں سے چرا کر لے جاتی ہے

خود غرض تو طائر ہوتے ہیں

سربراہِ حشرات کھا جاتے ہیں

کسی گھر کے چولہے بجھا دیتے ہیں

کسی دل کی دنیا اجاڑ دیتے ہیں

خود غرض تو پھول بھی ہوتے ہیں

عندلیپ کو کرتے ہیں تنہا

خود غرض تو آنکھیں ہوتی ہیں

توہینِ ضبط پہ چھلکتی ہیں

خود غرض تو آنسو ہوتے ہیں

شدتِ غم پہ ہنستے ہیں

خود غرض تو ہوتی ہے بہار بھی

سال بھر کے منتظر سے ملاقات سے قبل ہی مر جاتی ہے

خود غرض تو شجر بھی ہوتے ہیں

مشکل میں گراتے ہیں پتوں کو

خود غرض تو ہے مٹی جاناں

کسی کے اپنے کھا جاتی ہے

خود غرض تو فلک بھی ہوتا ہے

پہنچ سے دور رہتا ہے، مغرور رہتا ہے

خود غرض تو یادیں ہوتی ہیں

زخموں پہ نمک کو چھڑکتی ہیں

خود غرض تو درد بھی ہوتا ہے

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

کسی کو کر کے منتخب، اسی کو تڑپاتا ہے

یہ تو شامل ہے فطرت میں

ہے یہ ہر اک سے ہی پنہاں

یہ تو ہے اک اٹل حقیقت کہ

خود غرض تو سب ہی ہوتے ہیں

خود غرض تو تم بھی ہو جاناں

خود غرض تو میں بھی ہوں جاناں!

(از خود)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

نیلگوں آسماں، اور رزق کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتے طائر۔

ایسے میں ایک پرندے کی نظریں پنجرے سے باہر کو جھانک رہی تھیں۔

پنجرہ کھلا تھا، وہ زنجیروں کا قیدی نہیں تھا، وہ محبت کا قیدی تھا۔

اس کے پر آزاد تھے، دل مقید تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے فراق میں اداس تھا، مگر وہ ان سبز آنکھوں سے بے وفائی کیوں کر کرتا؟

وہ سبز آنکھیں جو اسے دیکھ کر چمک اٹھتی تھیں۔

وہ سبز آنکھیں جو اس کے گم ہو جانے پہ اتنا روئی تھیں، بچھڑ جانے پہ ان کا کیا حال ہو گا؟

وہ ایک چڑیا تھی۔ ایک عام چڑیا۔ مگر اسے خاص "محبت" نے کر دیا تھا۔

کچھ تو تھا اس میں جو وہ آنکھیں اس کے لیے نرم پڑ جاتی تھیں۔

کچھ ساعتیں بیتیں، اسے قدموں کی چاپ سنائی دی، مگر یہ آواز مختلف تھی۔ اسے سن کر اطمینان نہیں ہوا تھا، ڈر لگا تھا۔

اور پھر اس چڑیا نے خود کو اس مضبوط گرفت میں قید پایا۔

وہ سنہری آنکھوں والا خوبصورت بچہ تھا، اس کی آنکھیں بہت خوبصورت دکھتی تھیں، مگر وہ خوبصورت نہیں تھیں۔ ان میں ایک شیطانی سی چمک تھی۔

اور پھر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ چڑیا اپنے پر پھر پھراتی رہی، وہ معصوم بے زبان جان دار تڑپتا رہا، اور بالآخر تمام آوازیں دم توڑ گئیں۔

ہو کا عالم چھا گیا۔ بچے نے پرندے کو دیکھا اور اسے واپس پنجرے میں رکھ دیا۔

وہ پیچھے مڑا تو اس کی آنکھیں سبز آنکھوں سے ٹکرائیں، وہ آنکھیں جو آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔

بچی دوڑ کر چڑیا تک آئی، اسے اپنے چھوٹے اور ملائم ہاتھوں میں پکڑا۔

"تم نے۔۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟" وہ چلائی تھی۔

"یہ جاگ کیوں نہیں رہی، زیان؟" آنسو بہنے لگے۔

"تم نے میری چڑیا مار دی؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا، آنا۔۔ یہ ایسے ہی تھی۔"

"تم جھوٹے ہو، زیان۔۔ تم نے میری سپیرو کو مار دیا۔۔ امی۔۔ امی، زیان نے میری چڑیا مار دی۔" اب وہ روتے ہوئے باہر کی جانب بھاگی تھی۔

حال میں آؤ تو دیکھو کہ ہسپتال کے بیڈ پہ لیٹی لڑکی سسکی تھی۔

احمد اور عالیان اس کی طرف بڑھے۔

"کیا ہوا ہے، بچے؟" یہ آواز احمد کی تھی اور عالیان، وہ بس اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

"ابو۔۔ ابو۔۔ اس نے اسے مار دیا۔" وہ بچوں کی طرح سسک رہی تھی۔ "ابو، اس نے میری چڑیا کو مار دیا، ابو، آپ کو پتا ہے نا وہ کتنی پیاری تھی۔ ابو، وہ میرے لیے آسمان کو قربان کر رہی تھی، کوئی وفا کا بدلہ یوں دیتا ہے کیا؟"

احمد اور سدرا نے خاموش نظروں کا تبادلہ کیا جب کہ عالیان گہری سوچ میں تھا۔

"وہ مجھے اچھی لگتی تھی، ابو۔ کیوں ہر بار مجھ سے میری پسندیدہ چیزیں چھین لی جاتی ہیں؟" اب کی بار اس کی آواز سرد تھی، بے پناہ کرب خود میں لیے ہوئے تھی۔

"وہ میری تھی، ابو۔ میری چیزوں کو میرے پاس کیوں نہیں رہنے دیا جاتا؟" وہ اب تک سسک رہی تھی۔

احمد نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا؛ اور اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

اور اسی لمحے عالیان اور ایلیانہ کی نگاہیں ٹکرائیں۔ اور عالیان کو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں باتیں کر رہی ہیں۔

کسی غم کی داستاں سنا رہی ہیں۔

کسی کرب کا راز بتا رہی ہیں۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، ایلیانہ احمد نظریں چرا چکی تھی۔

●●●●●

کیا تمہیں یہ آواز سنائی نہیں دے رہی؟

جو وقت کے پردوں کو چیرتے ہوئے کہیں بہت پیچھے سے آ رہی ہے؟

کئی سال پہلے ہوا میں معلق ہوئے الفاظ تم سے گزارش نہیں کر رہے کہ تم ان کی آواز سنو، تم ان کی داستان سمجھو؟

"تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو؟" آواز میں بے یقینی پنہاں تھی۔

"شازم؟ کہاں تھے تم؟" کرب سے لبریز الفاظ۔

"آئرہ، تم اتنا شک کرو گی تو مجھے کھو دو گی۔" شازم نے مذاق میں بات ٹالی۔

"تمہیں کھو دوں گی؟ میں تمہیں نہیں کھو سکتی۔ تم۔۔ تم میرے ہو۔۔" وہ گم سم سا بولی۔

"دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا، آئرہ۔" اب اسے غصہ آ رہا تھا۔ ایک تو آفس کے مسائل دوسرا شک کرنے والی بیوی۔ بندہ جائے تو جائے کہاں؟

"شازم حمزہ۔ تم میرے ہو۔" وہ اس کے قریب آئی تھی۔

اور پھر دونوں نے ایک ساتھ بولا تھا۔

"اور جو میرا ہے وہ صرف میرا ہے۔" اور پھر شازم ہنس دیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"آئرہ، کم آن۔۔ تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں؟"

"ہے! مجھے دنیا میں ہر شے سے زیادہ اعتبار اپنے انتخاب پہ ہے۔ میرے اعتبار کو مت توڑنا، شازم حمزہ۔" اور آئرہ یہ کہہ کر، اسے خبردار کر کے آگے بڑھ گئی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

●●●●●

صفِ ماتم بچھ چکی تھی، نوحہ کی آواز گونجنے لگی تھی۔

اور میت سے لپٹی عورت تمہیں شناسا لگیں گیں۔

وہ ایک بچے کی لاش تھی۔ "میرا بھانجہ!"

"شازم اس نے میرے بچے کو مار دیا۔" وہ بارہا یہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

"میں نہ خود کو بچا سکی نہ اسے۔ یا اللہ!" وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگی۔

شازم نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

"یہ سب قسمت میں تھا، خود کو الزام مت دو، آئرہ۔۔"

رونے اور چلانے کی آوازوں کے درمیان ایک سرد آواز گونجی تھی۔

"قسمت انسان خود لکھتا ہے۔"

منظر تبدیل ہوا۔ یہ ایک نفیس کمرا تھا۔ اور اس میں بیٹھی لڑکی سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس، خلا کو تک رہی تھی۔

"یہ سب ہوا، کیوں کہ میں نے یہ ہونے دیا۔ میں نے اپنے بھانجے کو مرنے دیا۔۔ میری بہن، روزِ حشر اس کا سامنا کیسے کروں گی میں؟ کیا کہوں گی کہ میں اس کے وارث کا خیال نہیں رکھ سکی، کیوں کہ میں اپنی ازدواجی زندگی میں بہت مصروف تھی؟" آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی اور لمبے ناخن اس کی کلائی میں پیوست۔

"آئرہ، ریلیکس، اب اس صدمے سے نکل آؤ، آٹھ ماہ ہو چکے ہیں اس واقعے کو۔۔"

"میں اس سے باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی، میں نے اسے ایک ملازمہ کے ذمے چھوڑ دیا، میں نے اس کے ساتھ وہ کیا جو میرے ساتھ کیا گیا تھا۔۔ میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"آئرہ، ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔۔" وہ کہہ کر اٹھ گیا۔

"تم بھی مجھ سے اکتا گئے ہو نا؟" ایک جملہ اور ماحول کا تناؤ بڑھنے لگا۔

"اکتا گیا ہوں؟ تم سے؟ اور تمہیں ایسا کیوں لگا، آئرہ؟" وہ زخمی سا مسکرایا۔

"میں قاتل ہوں۔۔ میں نے اپنے بھانجے کو مار ڈالا۔۔" وہ بے ربط جملے ادا کر رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی، اس واقعے نے سب بدل دیا تھا۔

وہ راتوں کو سو نہیں پاتی تھی، سوتی تو ڈر کر، بدک کر اٹھ جاتی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ بیٹھے بیٹھے جانے کہاں گم ہو جاتی تھی۔ خود کو تکلیف دیتی تھی، ایک بار تو خودکشی کی کوشش بھی کر چکی تھی۔

عجیب باتیں کرتی تھی، وہ۔۔ وہ زندگی سے بے زار دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی، پر وہ روتی تھی۔

آنسو نہیں بہتے تھے، بس وہ غم کی مجسم تصویر بن جاتی تھی۔

شازم نے اسے دیکھا، اپنائیت سے، کرب سے۔۔

"اوہ کم آن، آئرہ۔۔ وہ سب قسمت تھی۔ مکتوب تھا۔ اسے ہونا ہی تھا۔ خود کو قصور مت دو۔۔" وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا اور اس کے سر کو اپنے کندھے پہ ٹکا دیا۔

"وہ مجھے نظر آتا ہے، ہر جگہ۔۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا میں اتنا بے وقعت تھا، خالہ کہ آپ نے مجھے یوں ہی رائیگاں جانے دیا؟ وہ بہت معصوم تھا، شازم۔۔"

اب وہ اس کے بال سہلا رہا تھا۔ اور خاموش ہو کر اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ ایک اچھا listener تھا۔

سورج کروٹیں بدلتا گیا، وقت گردش کرتا رہا۔۔

●●●●●

"میرا بیٹا کہاں ہے؟" وہ چلا رہی تھیں۔

"وہ کیسے گم گیا؟ وہ اپنے باپ کے ساتھ گیا تھا، احمد۔ باپ کی موجودگی میں بیٹے گم جاتے ہیں کیا؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھا چھوٹا لڑکا گاڑیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا اور سبز آنکھوں والی لڑکی، وہ آنکھوں میں آنسو لیے دروازے کی اوٹ سے سب سن رہی تھی۔

وہ اتنی بڑی تھی کہ سب سمجھ سکے۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا "بھائی" گم چکا ہے۔

وہ جان گئی تھی کہ اس کا اکلوتا دوست کھو گیا ہے۔

اور وہ کچھ ایسا بھی جانتی تھی جو وہاں اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ اسے دوبارہ کبھی بھی ہنستا، مسکراتا، یا کھیلتا نہیں دیکھ سکے گی۔

احمد سدرا کو امید دلا رہے تھے، حوصلہ دے رہے تھے۔

غلط کر رہے تھے۔

ایلیانہ احمد کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں، وہ جانتی تھی کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کبھی زندہ واپس نہیں آئے گا۔ اسے الہام ہو جایا کرتا تھا، اپنے دوستوں کے بارے میں۔

اپنے سے منسلک چیزوں کے بارے میں اسے وجدان ہوا کرتا تھا۔

ہمیشہ سے، اس کی گڑیا ٹوٹنے سے پہلے بھی اور چڑیا مرنے سے پہلے بھی یہی احساس تھا، یہ احساس کہ کچھ اس سے چھن رہا ہے۔

اب بھی یہی احساس تھا کہ **اس کی چیز اس سے لے لی گئی ہے۔**

اور اس دن اس نے پہلی بار خود کو کہا تھا۔

"میں اتنی بدبخت کیوں ہوں، میرے دوستوں کو مجھ سے چھین کیوں لیا جاتا ہے؟"

ایک معصومانہ سوال، جس نے اس کی خوشیوں اور سکون کو ڈس لیا۔

وہ اسی سوچ کے ساتھ بڑی ہوئی تھی کہ وہ **بدبخت** ہے اور وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ جسے بھی وہ اپنا بنائے گی، وہ بچھڑ جائے گا۔

●●●●●

حال میں آؤ تو تمہیں وہ ہسپتال میں ملے گی۔ مگر وہ بستر پہ بیٹھ کر رو نہیں رہی تھی نہ ہی یہ وہ کمرہ تھا۔

وہ اس فزیوتھیریپسٹ کو دیکھ رہی تھی، جو اسے گھٹنا موڑنے کو کہہ رہی تھی۔۔

وہ روز ایکسر سائز کر رہی تھی۔۔ امید تھی کہ وہ چل سکے گی، جلد چل سکے گی۔

ڈاکٹر کی کتھئی پروفیشنل آنکھوں کی جگہ احمد کی محبت بھری آنکھوں نے لے لی۔

اور ہسپتال کے کمرے کی جگہ گھر کے ٹی وی لاؤنج نے، وہ اس کا سر سہلا رہے تھے۔ اس کی باتیں سن رہے تھے اور اسے اپنی باتیں سنا رہے تھے۔

وہ پھر سے بولنے لگی تھی۔ یہ تبدیلی اچھی تھی۔ اس کے گھر والوں کو تو بہت پسند آئی تھی۔

"تم میرا پھول ہو، آنا۔ تم مرجھا جاتی ہو تو لگتا ہے کہ زندگی روٹھ گئی ہے مجھ سے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اسے باور کروا رہے تھے۔ وہ ان کی بات سن کر مسکرا رہی تھی۔۔

اب احمد کی آنکھوں کی جگہ اس کی نرم سرمئی آنکھوں نے لی۔ وہ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

اور وہ اشتیاق سے سن رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اسے وہ کتاب دے رہا تھا جو وہ ابھی لایا تھا، آنا نے کتاب تھامتے ہی اسے کھولا تھا۔

حسبِ معمول اس میں ایک خط تھا، وہ مسکرائی۔

مگر اس خط کے لفافے پہ لکھی تحریر پڑھ کر مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"اسے تب پڑھنا جب تمہارے پاس بات کرنے کو کوئی نہ ہو۔۔" اس نے ناراض ہو کر عالیان ک دیکھا تھا۔

"تب تک curiosity سے مر جاؤں گی میں۔" اور وہ سر گرا کر ہنس پڑا۔

"کچھ خاص نہیں ہے اس میں، اتنا خاص تو ہرگز نہیں کہ **ایلیانہ احمد** تجسس میں پاگل ہو۔۔" اس نے مذاق میں بات اڑائی۔

"اور نہ ہی عالیان ہادی س قابل ہے کہ تم اس کے لیے تجسس میں رہو۔۔"

"اسے تم نے لکھا ہے، ایلیانہ احمد کے لیے یہ خاص ہے، اس کا ہر حرف خاص ہے۔" اس نے سوچا، کہہ نہیں سکی۔ وہ عالیان ہی تھا جو با آسانی اظہار کر سکتا تھا۔

اس نے خط اپنے سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دیا۔

اور اب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے، کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں۔

پر سکون انداز، سکون بخش لہجہ، خوبصورت لمحے۔

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اسے **ہفتے کے دن** سے کتنی محبت ہے، پر اسے اظہار کرنا کہاں آتا تھا۔

اس کے کمرے کی سیاہ و سفید دیواروں کی جگہ ہسپتال کی دیواریں لے چکی تھیں۔

آج وہ پہلے دن کھڑی ہوئی تھی، پہلی بار اسے کھڑے ہونے نے اتنی خوشی دی تھی۔

دو منٹ، شاید اس سے بھی کم دیر۔ اور وہ لڑکھڑا گئی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، آنسوؤں نے منظر دھندلا دیا۔

وہ۔۔ وہ کھڑی ہوئی تھی۔ شاید ایک سال بعد، شاید ڈیڑھ سال بعد۔۔ اسے یاد نہ آیا۔

وہ رو رہی تھی۔ شکر کر رہی تھی۔

وہ خوش تھی، بے تحاشا خوش۔

زندگی کسی پہ اتنی مہربان بھی ہوتی ہے۔

دوپہر کے سورج کی جگہ شام میں ڈوبتے سورج نے لے لی اور آج دن ہفتے کا تھا۔

آج احمد ساتھ نہیں آسکے تھے، آج اس کے ساتھ عالیان تھا۔

وہ کئی دنوں سے چند قدم چلنا سیکھ رہی تھی۔

آج بھی وہی مشق جاری رہی۔ گرنا، لڑکھڑانا، سنبھلنا، پھر گرنا، اٹھنا، دو قدم چلنا اور یہ سائیکل جاری رہا۔

وہ گرتی تو وہ فوراً اٹھ جاتا، پریشانی سے، اس کی اٹھنے میں مدد کرتا، اس پہ ڈاکٹر جھلا کر کہتی۔۔

"آپ انہیں سہاروں کی عادت ڈال رہے ہیں، مسٹر عالیان۔ اور سہاروں کی عادت انسان کو کمزور بناتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں وہ کمزور بنیں؟" اور وہ فوراً نفی میں سر ہلا دیتا گویا ان کی بات سے ڈر گیا ہو۔

مگر ہر بار جب وہ گرتی تھی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت نہیں کر پاتا۔

بالآخر اس نے آنکھیں میچ لیں، اب وہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔

ان سے بہت دور آسمان پہ چھائے بادل ان لمحوں کو قید کر رہے تھے۔

اپنے پر اسرار سفید رنگ میں۔

●●●●●

سورج ڈوب رہا تھا، پرندے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔

دروازے پہ دستک ہوئی، وہ صوفے پہ لیٹی، سو رہی تھی۔

اور کچی نیند میں بھی اس نے اس کے قدموں کی چاپ کو پہچان لیا تھا۔

اس نے اٹھنا چاہا، اس شخص سے ملاقات کے لیے تو وہ جانے کیا کچھ قربان کر سکتی تھی، یہ تو بس نیند تھی۔

مگر نیند کا اسے آزاد کرنے کا دل نہ تھا۔

سو اس نے ہلکی سی آنکھیں کھولیں گویا یقین کرنا چاہا ہو کہ وہ اس کا کوئی حسین خواب ہے، کوئی وہم ہے یا خوبرو حقیقت۔

وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں نرمی سمائے۔

آج ہفتہ نہیں تھا، آنا نے اپنے دل کو سمجھایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اب اسے سدرا کی آواز سنائی دی، وہ اسے اٹھنے کو کہہ رہی تھیں۔

اور پھر اس کی آواز۔ اور نیند کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔

اس آواز کی خاطر وہ کہیں سے بھی واپس آ سکتی تھی، یہ تو بس نیند کی قید تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے تحیر سے پوچھا۔

"تم؟ آج ہفتہ نہیں ہے؟" وہ ٹی وی لاؤنج میں اکیلے تھے۔

سدرا کچن میں تھیں۔

وہ دلکشی سے مسکرایا، اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی انگلی پہ کچھ باندھنے لگا۔

اس نے نگاہوں کا رخ موڑ کر دیکھا تو وہ پھولوں سے بنی ایک انگوٹھی تھی۔

"تمہیں واقعی یاد نہیں آج کیا تاریخ ہے؟" آہ، اس کا دلفریب لہجہ۔

"آج سے ایک سال پہلے مجھے آپ سے نوازا گیا تھا، ایلیانہ احمد۔ آج ایک ایک سال قبل مجھے دنیا کے خوش نصیب لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت حسین تھی۔

دماغ نے اعتراف کیا۔

"اس کی آنکھوں کی طرح!" دل نے اضافہ کیا۔

سدرا اب سامنے بیٹھی تھیں۔ اور سامنے ایک کیک بھی تھا۔

"آنا میٹھا شوق سے کھاتی تو نہیں، اب تم خود ہی پوچھ لو کہ یہ کھائے گی یا نہیں۔"

"کھاؤ گی، ایلی؟ میں نے بنایا ہے؟" وہ جو نفی میں سر ہلانے والی تھی، آخری بات پہ تھم گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ تقریباً آدھا کیک کھا چکی تھی۔ سدرا اپنی مسکراہٹ چھپا رہی تھیں اور عالیان یہ زحمت بھی نہیں کر رہا تھا۔

اور ایلیانہ احمد کو اس دن احساس ہوا تھا کہ اسے میٹھا حد سے زیادہ پسند ہے۔

اس دن وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ان کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں، وہ ساتھ ہوتے تو زمان و مکاں کو بھول جاتے تھے۔

●●●●●

اپارٹمنٹ کی سفید اور نیلی دیواروں نے اس شخص کو پہلی بار، کسی سے نرمی سے بات کرتے سنا۔

وہ اس وقت ایک ضدی مصور سے التجا کر رہا تھا۔

ایک درخواست، اپنی مرضی کی تصویر کی۔

"عالیان ایک تصویر ہی تو ہے۔ مشکل بھی نہیں ہے، ایک جھیل اور جھیل پہ بیٹھی سفید ہنس۔ کیا مشکل ہے اس میں؟"

"میں فارغ نہیں ہوں، داؤد۔ اور یہ درخواست تم اس ہنس سے جا کر کیوں نہیں کرتے؟ کہ وہ خود ہی تمہاری زندگی میں آجائے اور تمہیں اس کی تصویروں کے لیے مصوروں کی منتیں نہ کرنی پڑیں۔" اس نے کافی کے مگ کو لبوں سے لگا لیا۔

"ہنس سے باتیں کون پاگل کرتا ہے؟ کر بھی لوں تو بے زبانوں کے الفاظ پہچاننے نہیں آتے مجھے۔" اس نے غصے سے کہا۔

"اوہ واقعی؟ مجھے لگا وہ لفظ نہ بھی کہے تب بھی تم سمجھ سکتے ہو۔۔" اب داؤد کو غصہ آ رہا تھا۔

"داؤد، اس سے بات کرو۔ وہ مان جائے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ آگ یکطرفہ نہیں ہے۔" اب اس نے نرمی سے سمجھایا۔

"عالیان ہادی، تم مجھے سمجھ نہیں رہے۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گیا، پھت ذرا توقف سے کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ ہنس اس قدر خوبصورت ہے، اتنا اچھا ہے کہ مجھے ڈر لگتا کے کہ مجھ میں جلتی آگ اسے نگل لے گی، میرا انتقام اسے کھا جائے گا، مجھے ڈر لگتا ہے کہ۔۔ میری سیاہی اسے بھی سفید نہیں رہنے دے گی۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر مارنے لگتی ہے کہ۔۔۔ کہ میں اسے کھو دوں گا!" وہ درد میں تھا۔ آج وہ بے تحاشا درد میں تھا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے نا، داؤد، کہ تمہارے ساتھ جلنا اسے اپنے ہی اندر گھٹ گھٹ کے مرنے سے زیادہ عزیز

ہو؟"اس نے تسلی دی۔

"یہ سچ نہیں ہے!"اس نے اس کی تسلی کو رد کر دیا۔

"واقعی؟ کبھی تم نے غور سے دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں جب وہ تم سے بات کرتی ہے۔ کیا تم نے کبھی نہیں دیکھا اس چمک کو جو صرف تمہارے لیے آتی ہے؟"

"کون سے ناول پڑھ رہے ہو تم آج کل؟"اس نے ہاتھ میز پر زور سے مارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھاگتا تھا محبت سے۔

اپنے اصل سے۔

پیچھے عالیان کی آواز گونجی۔

"تمہیں نہیں لگتا داؤد کہ اپنی چیزوں کے لیے، ان کی محبت کے لیے خود غرض نہ ہونا گناہ ہے۔"اس نے اس کی بات کو سنا، سمجھا اور ہولے سے کہا۔

"خود غرض ہی تو بن رہا ہوں!"

●●●●●

کمرے میں خوف کی لہر سی پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ لفظ جگمگا رہے تھے۔

"کو کھونا چاہتے ہو اپنی زندگی کو؟ تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تمہیں موت عزیز ہے؟"

اگلا میسج تھا۔

"تو کھونا*"

اسے بارہا غصہ آ رہا تھا۔

اور ایک عجیب سا ڈر جسم میں سرائیت کر رہا تھا۔

اسی لیے نہیں کہ اسے موت ڈرانے لگی تھی۔ بلکہ اسی لیے کہ وہ اس کے نمبر کے باوجود، ہیکنگ اور ٹیکنالوجی کو اتنا جاننے کے باوجود، اپنے دشمن تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر تھا۔

وہ اسے دیکھ رہا تھا، اسے دھمکا رہا تھا۔

اور داؤد عمر یہ تک نہیں جانتا تھا کہ وہ ہے کون۔

عجیب بے بسی تھی۔

کیا وہ مرنے سے قبل اپنا انتقام تک نہیں لے سکتا تھا؟

کیا وہ اس قابل بھی نہ تھا؟

اور اس میسج کا کیا مطلب تھا؟

اسے موت عزیز ہے؟

جواب ہاں تھا۔

کیا واقعی؟ اس نے پوچھا اور دل و دماغ میں ایک عجیب جنگ شروع ہو چکی تھی۔

●●●●●

موجودہ دن سے تقریباً چھ سال قبل کچھ واقعات تمہاری توجہ چاہتے ہیں۔ تم سنو گے نہیں ان کی روداد؟

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عالیان ہادی لا کا سٹوڈنٹ تھا۔

وہ اس وقت بائیس سال کا تھا۔ ابھی ابھی وہ اپنی beauty sleep سے جاگا تھا، وہ پورے ہفتے کی نیند ایک ہی دن لینے کا عادی تھا۔

اور آج وہی ایک دن تھا۔

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کھڑکی سے روشنی سیدھا اس کے کمرے تک پہنچ رہی تھی۔

وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ اور اس اے پہلے کہ وہ پردے کھڑکی پہ گرا کر پھر سے لیٹتا، اسے وہ آواز سنائی دی۔

اس کے باپ کی آواز اور نیند جھٹ سے اڑ گئی۔

کچھ خوف تھا اور کچھ محبت کہ وہ باہر کی طرف کھینچا چلا گیا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو انہیں اپنی طرف دیکھتا پایا، گویا اسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

پھر وہ سلام کر کے کچن کی طرف چلا گیا۔

داؤد بھی ابھی گھر نہیں تھا۔ اور یہ بات اسے اور غیر آرام دہ کر رہی تھی۔

"آپ نے ناشتہ کر لیا؟" اس نے مروتاً پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ میں دوپہر تین بجے تک تمہارے جاگنے کا انتظار تو نہیں کر سکتا تھا نا۔" یہ سن کر اس نے سکھ کا سانس لیا اور ان کے ساتھ آ بیٹھا۔

"کتنے بچوں کے ہاتھ منہ توڑو گے، عالیان؟" اب وہ سنجیدہ تھے۔

"وہ میرے دوستوں کو تنگ کرتے ہیں۔" اس نے جان چھڑوانا چاہی۔

"اوہ، تو تم نے اپنے دوستوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟" وہ خاصے غصے میں تھے۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اور یہ آنکھوں کا کیا حال بنا رکھا ہے؟ رات بھر کیا کرتے ہو؟ کس کا سوگ مناتے ہو؟" عالیان کے ماتھے کی نسیں ابھرنے لگیں۔

"نیند نہیں آتی مجھے۔" اس نے بہت صبر سے جواب دیا۔

"کسی لڑکی کا چکر ہے؟" اب انہوں نے خاصے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

عالیان کی آنکھیں تحیر سے کھل گئیں۔ یہ اس کا باپ کس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

"بابا، آپ کیسے آ گئے؟" وہ باتوں کا رخ موڑ رہا تھا۔

"میرا گھر ہے، میں آ سکتا ہوں۔"

"آپ کو آپ کے گھر کی یاد آتی ہی نہیں نا۔ اسی لیے حیران ہو رہا ہوں۔" اس کی آواز میں کرب تھا۔

فی الحال اس کے اندر کا وہ بچہ بول رہا تھا جو ماں باپ کی محبت کے لیے ترسا تھا۔

جو تڑپا تھا ایک ایک پل کی توجہ کے لیے۔

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتے، ان کے فون کی گھنٹی بجی۔

انہوں نے عالیان کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا، اس نے ہولے سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اب وہ فون پہ بات کر رہے تھے۔

فون کا سپیکر چلا ہوا تھا سو آواز عالیان تک آ رہی تھی۔

وہ احمد انکل سے بات کر رہے تھے، عالیان ان کی آواز پہچانتا تھا۔

اسے پھر نیند آ رہی تھی۔

وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا چکا تھا، اور نیند کی وادیوں میں اترنے سے قبل اس نے وہ آواز سنی۔

"ابا، آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ سنڈے آپ کا اور میرا ہو گا۔"

وہ کسی پری کی آواز تھی۔ کسی اپسرا کی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

نیند جھٹ سے اڑ گئی اور وہ پوری طرح جاگ گیا۔

اس کا جسم کا ہر رواں اس آواز کے پھر سے گونجنے کا منتظر تھا۔

"ابا۔۔"

وہ یکدم وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے یقین تھا کہ وہ ایک پل اور وہاں بیٹھتا تو مسحور ہو جاتا۔

اس کمبخت کو یہ وہم تھا کہ وہ فی الحال سحر کا شکار نہیں بنا۔

کتنا ناسمجھ تھا وہ۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے سوچا۔ بہت سوچا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔

اور پھر ایک جھماکا ہوا۔

کسی کی سبز آنکھیں ذہن کے پردوں پر لہرائیں اور وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیا۔

اس کے کمرے میں چھن کے آتی دھوپ کی جگہ اس صحن نے لے لی جس پہ سفید دریاں بچھی ہوئی تھیں۔

ہر طرف آہ و بکا تھی۔ اور وہ ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا ہوا تھا۔

جب ایک بچی لڑکھڑاتی ہوئی اس تک پہنچی۔ یقیناً اس نے نیا نیا ہی چلنا سیکھا ہو گا۔

وہ تقریباً دو سال کی تھی۔

"آپ رو رئے او؟"

(آپ رہ رہے ہو؟) اپنی توتلی زبان میں اس نے پوچھا۔

"اس نے بہت آرام سے اس کو خود سے دور کرنا چاہا۔

مگر وہ پھر لڑکھڑاتی ہوئی اس تک آ گئی۔

"آپ نے مجھے دھکا دیا؟" اب اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

بچے نے اس کی سبز آنکھوں کو دیکھا تو اس کے اپنے آنسو تھم گئے۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے کہہ کر سر جھکا دیا۔

"راپنزل، عالیان کو تنگ مت کرو۔" اب پیچھے سے اس کا بھائی آیا تھا۔

اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

"بھائی، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔ آپ ہمیں interrupt کر رہے ہیں۔" اسے سن کر عالیان نے کندھے اچکا دیے گویا کہہ رہا ہو کہ بولنے دو اسے، بچی ہے۔

اور بچی شہ ملنے پہ اور ڈھیٹ بنتے ہوئے اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اب بتائیں، آپ کیوں رو رہے تھے؟"

"کیوں کہ میری امی مر گئی ہیں۔۔" اس نے کہہ کر اس سے نظریں ہٹالیں۔

جانے اسے دیکھ کر اس بچی کو کون کون سے سوال یاد آجاتے۔

"وہ پری آپ کی امی تھیں؟" اب عالیان زچ ہونے لگا تھا۔

"میری امی کہتی ہیں کہ اس دنیا میں ملنا ضروری نہیں ہوتا۔" اور اس دو سال کی بچی کی بات سن کر اس کا پورا جسم سن ہو گیا۔

اسے اپنی ماں کی آواز اپنی سماعتوں میں گونجتی محسوس ہوئی۔

"کیا اس دنیا میں ملنا ضروری ہے؟"

اس نے نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ وہ اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرا رہی ہے۔

اس کی مسکراہٹ دوا تھی۔

اس کا دیکھنا شفا۔

وہ نم آنکھوں سے شدید کرب میں بھی مسکرا دیا۔

وہ نم آنکھوں سے مسکرا رہا تھا، پر وہ ایک بچا نہیں تھا، ایک بائیس سالہ نوجوان تھا۔

●●●●●

پانچ سال میں اسے کتنی دفعہ وہ دھندھلا سا منظر یاد آیا، جہاں ایک پیاری سی بچی اسے دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔

اور پانچ سال میں کتنی دفع اس کی سماعتوں میں اس خوبصورت آواز نے رس گھولا تھا، اسے یاد نہ تھا۔

یاد تھا تو یہ کہ سحر چھا چکا تھا۔

یاد تھا تو یہ کہ وہ شکار بن چکا تھا۔

اس آسیب کا جسے شاعروں نے سمجھا، زخمیوں نے مرہم مانا اور انسانوں نے موت۔

وہ راز جو ہر اک پہ عیاں نہیں ہوتا اس پہ اچھا خاصا عیاں ہو کر اسے ان دیکھی آگ میں جھلسانے لگا تھا۔

اور پھر ایک دن ہادی نے داؤد اور عالیان کو بٹھا کر جب یہ کہا کہ ان کی شادی کی عمر ہو گئی ہے۔

تو اس کے جسم کا ہر رواں چلا چلا کر یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے؟

وہ لڑکی جو سراپا محبت تھی؟

وہ اس انسان کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا جس کا اسے نام معلوم تھا اور نہ ہی یہ کہ وہ کیسی دکھتی ہے۔

بہت ہمت کر کے بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

مگر اس نے سنا تھا، داؤد کو یہ پوچھتے ہوئے۔

"احمد انکل کی بیٹی کی شادی ہو گئی ہے؟" جس پر ہادی نے ذرا تحیر سے اسے دیکھا۔

اور پھر مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ عالیان کو سبز رنگ بہت پسند ہے، ماموں۔۔" اور عالیان کے گال لال پڑنے لگے۔ اس کا دل چاہا کہ داؤد کا گلا دبا دے۔

دل تو خیر اس کا داؤد کو گلے سے لگا لینے کا بھی چاہ رہا تھا۔

ہادی عالیان کی حالت دیکھ کر حیران نہیں ہوئے، مگر ایک سوال ضرور پوچھا تھا۔

"تم اس کو جانتے ہو؟"

عالیان نے نفی میں سر ہلایا۔

"دیکھا ہے اسے؟"

"جب وہ دو سال کی تھی شاید، تب دیکھا تھا۔" اس کی آنکھیں اب بھی میز کو ہی گھور رہی تھیں۔

"تو پھر اس کے نام پہ یوں لال پیلے کیوں ہو رہے ہو؟" اب انہیں اس پہ ہنسی آ رہی تھی۔

"میں نے اس کی آواز سنی ہے۔" کافی دیر بعد اس نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔" اس نے کہہ کر کندھے اچکا دیے۔ داؤد اب چاہ کر بھی اپنی ہنسی روک نہیں پایا۔

باہر سورج ڈوب رہا تھا۔

●●●●●

سورج ڈوب رہا تھا، اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتی تھی تو پھر کسی کو کہاں دیکھ پاتی تھی۔

وہ اسے ہر بار یوں دیکھتی تھی گویا پوری زندگی اندھیرے میں گزارنے کے بعد کوئی مسافر سورج کی پہلی کرن دیکھتا ہو۔

جس طرح صدیوں کا بیمار کسی دوا کو دیکھتا ہو۔

جیسے صحرا میں بھٹکتا پیاسا پانی کے پہلے قطرے کو دیکھتا ہو۔

جیسے تاروں کی بستی میں رہنے والے چاند کو دیکھتے ہوں۔

المختصر، وہ اسے ایسے دیکھتی تھی جیسے کوئی مایوس معجزے کو دیکھتا ہو۔

"مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے ایلی، تم مجھ سے شادی کے لیے راضی کیسے ہو گئی؟" وہ سورج کو دیکھتے ہوئے، جی ہاں، آپ صحیح سمجھے، اس سے نظریں چراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سوچا برف کا محل سنبھال نہ پائی تو؟ سکون کی آگ کو انکار کیسے کرتی، عالیان؟"

وہ مسکرائی اور بات جاری رکھی۔

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ ایو جین کو پانے کے لیے راپنزل بننا پڑتا ہے۔ کسی نے پہلی بار برف کی شہزادی کو قبول

کیا تھا اس کی پوری سلطنت کے ساتھ۔ کسی نے پہلی بار مایوس کو معجزے سے نوازا تھا۔ میں معجزے کو انکار کیسے کرتی، عالیان؟" وہ آنکھوں میں نمی لیے مسکرا دی تھی۔

"ایسے ہی ناولز والے ڈائلاگ پسند ہیں نا تمہیں؟" وہ بے چارا ابھی پوری طرح خوش بھی نہیں ہوا تھا اور یہ میڈم ظلم ڈھانا شروع بھی کر چکی تھیں۔

"تم نے مجھ سے شادی کیوں کی، عالیان؟" اب اس کی باری تھی۔

"بابا کہہ رہے تھے احمد کی بیٹی اچھی ہے، میں نے سوچا کر لیتے ہیں شادی، مجھے کیا پتا تھا کہ تم اتنی ظالم نکلو گی۔" انتقام مکمل ہوا۔

آنا نے اس جواب پہ اسے گھورا اور پھر وہ دونوں ہنس دیے۔

وہ عجیب تھے، حد سے زیادہ عجیب۔

تھوڑی دیر وہ سورج کو دیکھتے رہے اور پھر اس کے فون کی آواز گونجی۔

"لاہور آئے ہو؟ مجھے ملنا ہے تم سے۔" وہ میسج زیان حیدر کی طرف سے موصول ہوا تھا۔

عالیان کی آنکھوں میں شدید غصہ ابھرا۔ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسے اٹھتا دیکھ ایلیانہ کی آنکھوں کی چمک غائب ہوئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کچھ حساب چکانے ہیں۔" اس کی گردن کی نسیں ابھر رہی تھیں۔

وہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کبھی عالیان ہادی کو اتنے غصے میں دیکھا تھا بھی کہ نہیں۔

"کچھ ہوا ہے؟" وہ سہم گئی تھی۔ کسی انجانے خوف سے۔

"جو بھی ہوا ہے، آج صحیح ہو جائے گا۔" وہ آگے بڑھنے لگا۔ آنا نے اپنی سٹک پکڑی اور لڑکھڑاتے ہوئے

اس تک جانے کی کوشش کرنے لگی۔

"مت جاؤ، عالیان!" اس نے پکارا تھا۔

اس کی آواز خوف سے کانپی تھی۔

اور عالیان ہادی رک گیا۔

اس کی آواز نے اس کے قدموں پہ زنجیر باندھ دی تھی۔

وہ اس تک آیا۔

"تم ڈر رہی ہو؟" سوال تھا۔ وہ حیران تھا۔

"کس سے؟" نیا سوال۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ عالیان کا دل ڈوب کے ابھرا۔

"زیان سے۔۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، عالیان۔ اس کے پاس مت جاؤ!" اس نے التجا کی، اور اس کی آنکھیں اور نم ہونے لگیں۔

اس نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ایلی، آج جانا ضروری ہے۔۔ آج جانے دو۔ آج مجھے یہ مسئلہ سلجھانے دو۔ پھر ہم اس پہ تفصیل سے بات کریں گے۔" اور وہ شخص آگے بڑھ چکا تھا۔

اس نے اگے بڑھنا چاہا، مگر وہ جا چکا تھا۔

اس نے چلانا چاہا، حلق میں گویا کانٹے اگنے لگے۔

پر اس نے کوشش کی، اسے یاد تھا کہ وہ چلائی تھی۔

"رک جاؤ، عالیان۔ آج مت جاؤ!"

وہ جا چکا تھا۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

وہ گر چکی تھی، کیوں کہ وہ نہیں تھا!

وہ جا چکا تھا۔

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسوؤں نے اس پہ ترس کھایا۔ حزن اس کا بن کے آیا تھا۔

وہ روتی گئی۔

وہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کا وقت تھا۔ ہفتے کا دن اس کا تھا۔

وہ اس دن کو کیسے کسی اور کو دے سکتا تھا؟

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اسے کیسے چھوڑ کر جا سکتا تھا۔

وہ بھی اس وقت جب اس نے منتیں کی تھیں کہ وہ رک جائے۔

کیا تھا اگر وہ رک جاتا۔ ایک بار اس کے کہنے پہ رک جاتا۔ وہ اسے بتاتی کہ وہ کیوں سہمی ہوئی تھی۔

کیا ہو جاتا اگر وہ شخص اس کا مان رکھ لیتا۔

وہ روتی جا رہی تھی۔

اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی پتھریلی راستے پہ بالکل تنہا کھڑی ہے۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ فضائیں بھی سہمی ہوئی ہیں۔

اسے لگا کہ آسمان رونے کو تیار ہے۔

اسے لگا کہ اس کا دل خوف و تکلیف سے پھٹ جائے گا۔

اسے لگا کہ اپنے گھروں کو جاتے پرندے اسے کوئی داستان سنا رہے ہیں۔

ہولے سے چلتی ہوا اسے خبردار کر رہی ہے۔

اسے اتنا کچھ محسوس ہوا کہ اسے لگا کہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی پرندے کی داستاں نہیں سننا چاہتی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسے یقین ہو گیا کہ اسے فضاؤں کے خوف کی وجہ نہیں جانتی۔

اسے یقین تھا کہ جان لیا تو جان جائے گی۔

"نہیں نہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی

آپ نے کوئی غلط خبر سنی ہو گی

کچھ آنکھوں کا سراب ہو گا

کچھ جھوٹے الفاظ کا ملاپ ہو گا

زمانے کی کوئی سازش ہو گی

یا دشمن کی کوئی چال ہو گی

کسی کی غلط بیانی ہو گی

کوئی جھوٹی سی کہانی ہو گی

اے کالے بادل نہ برس

اے ریت کے ذرے نہ تڑپ

پیارے پھولوں تم مسکراؤ

میرے پرندوں تم چہچہاؤ

تم سب تو میرے احباب ہو

تاریک کتاب میں روشن باب ہے

آؤ اس راستے کی خبر تو لیں

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ذرا اس کی جرات کی داد تو دیں

جو رو رو کے سب کو بتا رہا ہے کہ

وہ میرا شہر چھوڑ گیا ہے!!"

●●●●●

اتوار والے دن اس کا فون آیا تھا، مگر اس نے اس کا فون نہیں اٹھایا تھا۔

"یہ بات کرو، آنا۔ عالیان کا فون ہے۔" جب سدرا نے اس کے کمرے آ کر اسے فون دینا چاہا تو اس نے کندھے اچکا کر ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"میں کسی عالیان کو نہیں جانتی۔" دوسری طرف اس کا دل چاہا کہ اپنا گلا دبا دے۔ وہ ایک بار پھر ایلیانہ احمد کا دل دکھا کر اس کی ناراضگی کما چکا تھا۔

اس نے کچھ کہے بنا فون کاٹ دیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا، حتی کہ "ہفتے" کا دن آ گیا۔

اور اس کے گھر کا دروازہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ پورا دن اس دروازے پہ دستک کی منتظر رہی تھی۔

اور شام کے وقت وہ انتظار کر کر کے تھک گئی تو اسے لگا وہ رو دے گی۔

اس نے فون اٹھایا اور اس کا نمبر ملایا۔

اس نے فون نہیں اٹھایا، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس نے وائس نوٹ ریکارڈ کرنا شروع کیا۔

"مجھے تم زہر لگتے ہو، عالیان ہادی۔ زہر سے بھی زیادہ برے۔ مجھ سے آئندہ کبھی بھی بات نہ کرنا۔ کبھی بھی نہیں۔ تم بالکل اچھے نہیں ہو۔ میں نے پورا دن تمہارا انتظار کیا تھا۔ تمہارا انتظار۔۔" وہ تلخی سے ہنس دی۔ اس کی آواز صاف بتا رہی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

"تمہیں بہت شوق ہے نا مجھ سے دور رہنے کا، اب رہو دور۔ سمجھو مر گئی ایلیانہ احمد، ہمارے درمیان موت آگئی، اب مجھے کبھی بھی اپنی شکل مت دکھانا۔ اور تمہاری آنکھیں ڈراؤنی ہیں، اور کوئی شہزادے نہیں لگتے تم مسکراتے ہوئے۔" وہ بے ربط جملے بولتے ہوئے اپنے پورے ہفتے کی بھراس نکال رہی تھی۔

وہ ابھی وائس نوٹ بھیج کر فارغ ہوئی ہی تھی جب سدرا نے کہا۔

"اسے کچھ کام تھا، اب ظاہر ہے تم تو اس سے بات کرتی نہیں ہو، تو جس سے بات ہوتی ہے اسے ہی بتائے گا نا۔" ان کے طنز پہ وہ سلگ کے رہ گئی۔ اس نے غصے میں اپنی سٹک پکڑی اور تقریباً گرتے گراتے اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

●●●●●

دو گھنٹوں بعد اس کے میسج سنتے ہوئے وہ تڑپ اٹھا تھا۔

وہ رو رہی تھی، اس کے لیے، اس کی وجہ سے۔

وہ کہہ رہی تھی کہ " سمجھو ایلیانہ احمد مر گئی۔۔" اور عالیان ہادی کا دل چاہا کہ وہ مر جائے۔

اس نے کہا کہ ان کے درمیان موت آگئی، اور اسے لگا وہ واقعی مر چکا ہے۔

وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے اس کا انتظار کیا، اور اسے لگا اس کا دل تکلیف سے پھٹ جائے گا۔

اس نے زندگی کو رلا دیا؟ کوئی اس سے زیادہ بدبخت بھی ہو سکتا ہے۔

اس نے اسے کال کی، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں اٹھائے گی۔ اس نے اسے کئی میسج کیے حالانکہ اسے یقین تھا وہ نہیں سنے گی۔

●●●●●

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور جمعے کے دن وہ آیا تھا۔

ہاتھ میں سفید پھول، ایک ڈبہ جس میں جانے کیا تھا، ایک کتاب اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے لیے۔

ایلیانہ احمد کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھیوں میں بھینچ لیا ہو۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں تھی، عالیان کے آنے پہ سدرا کچن میں داخل ہو گئیں۔ عالیان نے انہیں اپنے ہاتھ میں موجود ڈبہ پکڑایا تھا۔

اب عالیان اس کی طرف بڑھ رہا تھا، اور اس کے ہر قدم کی چاپ کو سنتے ہوئے اس کا دل اقرار کر رہا تھا کہ اس نے دو ہفتے اس ایک آواز کا ہی تو انتظار کیا تھا۔

وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا تو آنکھوں نے یاد دلایا کہ یہ منظر تو ایلیانہ احمد کے لیے سب سے اہم تھا۔

وہ اس کے سامنے آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

اس نے دیکھا کہ ایلیانہ احمد اس کا ہاتھ تھام کے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

بے آواز مگر شدت سے۔۔

وہ ساکت ہو گیا، وقت تھم گیا۔

وہ اس کے ہاتھ پہ سر ٹکائے روتی گئی۔ وہ اس کی حالت پہ پریشان ہو گیا تھا۔

"ایلی، آئی ایم ریئلی سوری۔" اس نے کہا تو اس نے گھائل سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیا۔

"مجھے وہ سب نہیں کہنا تھا، مجھے لگا تم۔۔" آواز گویا بند ہو گئی۔

"مجھے لگا تم مجھے چھوڑ دو گے، مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے لگا تم کبھی نہیں آؤ گے۔۔" وہ اس کے ہاتھ کو چھوڑ نہیں رہی تھی، گویا سہم گئی ہو اس کے دور جانے سے۔

عالیان نے دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کے اس کے آنسو پونچھے۔

"تمہیں کیوں لگا، ایلی، کہ مایوس میں اتنی ہمت ہے کہ معجزے کو چھوڑ سکے؟" وہ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کے پوچھ رہا تھا۔

"تم ایسے روتی ہو نا جب، جب میری وجہ سے ایسے روتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود کو ماروں، بہت ماروں۔ تم جب روتی ہو تو مجھے لگتا ہے کسی نے میری بہترین تصویر پہ سیاہی گرا دی ہو۔ تم روتی ہو تو لگتا ہے کسی نے میری پسندیدہ کتاب پھاڑ دی ہو۔ تم روتی ہو تو لگتا ہے کسی نے سکون کو زہر دے دیا ہو۔ تم روتی ہو تو لگتا ہے کسی نے یہاں،" اس نے سینے پہ دل کے مقام پہ دستک دی۔

"یہاں نشتر مارے ہوں۔ تم روتی ہو تو یوں محسوس ہوتا کہ میری متاعِ کل ضائع ہو گئی ہو۔" وہ ایک سحر کے زیر اثر بولتا گیا اور کسی طلسماتی لمحے کے اثر میں قید لڑکی نے اس کی بات کاٹی اور سوال کیا۔

"اور عالیان ہادی کی متاعِ کل کیا ہے؟"

"آپ کی مسکراہٹ!" وہ اس کی گہری آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

اور وہ روتے روتے مسکرا دی۔

مسکرا تو وہ بھی دیا تھا۔

وہ گرجتے بادلوں اور برستی بارش کے درمیان قوس قزح کا منظر تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

باہر سورج ڈوب رہا تھا، اندر تلارے جھلملا رہے تھے۔

"واک پہ چلیں؟" اب یہ ان کا معمول تھا، وہ جب آتا وہ سیر کے لیے نکل جاتے۔

ابھی بھی وہ سدرا کو بتا کر باہر نکل چکے تھے۔

ایلیانہ احمد سٹک کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے بھی اس سے تیز چل رہی تھی۔

"اس کی رفتار کچھ زیادہ ہی کم تھی!" اس رات ڈائری لکھتے وقت اس سطر پہ وہ تھم گئی تھی۔

"امی اور ابو جب میرے ساتھ چلتے ہیں تو ان کی رفتار بھی مجھ سے کم ہوتی ہے، اس کی رفتار بھی مجھ سے کم تھی۔ تم جانتی ہو ان سب کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ میں ایک بار پھر دنیا کی رفتار کا

مقابلہ کر سکوں گی۔ مجھ پاگل کو لگنے لگا تھا کہ میں پھر سے اسی تیز رفتاری سے چلنے لگی ہوں۔۔ پر اس دن مجھے احساس ہوا۔۔ جب وہ بچہ گرا تو میں نے دیکھا کہ عالیان ہادی کی رفتار تو اچھے اچھوں سے زیادہ تیز ہے۔ اور اسی پل مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ میرے ہر قدم سے قدم ملا کر چلنے کی خاطر اپنی تیز رفتار قربان کرتا ہے۔ وہ تو ہر قدم محتاط رہ کر اٹھاتا ہے، وہ تو ہر موڑ پہ ڈرتا ہے کہ اس کے تیز قدم کہیں میرا دل تو نہیں توڑ رہے۔ اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مجھے اس شخص میں کیا اچھا لگتا ہے، تو میں سر جھکا کر ہنس دیتی ہوں۔ میں کسی کو کس طرح سمجھاؤں کہ مجھے اس میں کیا کیا اچھا لگتا ہے!"

وہ ڈائری پہ سر رکھ کر سو چکی تھی۔

سونے سے پہلے آخری تصور اس شخص کا تھا، اور اٹھتے ہی پہلا خیال؟ وہ بھی اسی کا تھا۔

●●●●●

شام کے ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہے تھے۔

اس وقت وہ ایک باغ میں ٹہل رہے تھے جب ایک بچے کے رونے کی آواز نے ان کی توجہ مبذول کی۔

اور فوراً ہی وہ آوازیں شور میں بدل گئیں۔

اور اگر تم اس لڑکی کی گہری آنکھوں میں دیکھو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ ڈر چکی تھی۔

بری طرح۔

اسے شور کی جگہ نوحے کی آوازیں آنے لگیں۔ اسے باغ کی جگہ بنجر زمیں دکھنے لگی۔

یہ وہ وقت تھا جب عالیان اسے وہاں رکنے کو کہہ کر اس شور کی طرف بڑھ چکا تھا۔

اسے لگا اس کا سانس رک رہا ہے، مگر وہ سب پھر بھی قابلِ قبول تھا حتی کہ اسے عالیان کی چیخ سنائی دی۔

اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو وہ منہ کے بل گری تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور جان حلق میں۔

اس کی سڑک ایک طرف کو گری تھی۔ ابھی سورج مکمل ڈوبا بھی نہیں تھا اور اسے ہر سو اندھیرا دکھ رہا تھا۔

وہ اٹھی۔ اور وہ چل رہی تھی، وہ بھاگ رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، مگر آواز اتنی تھی کہ بمشکل خود کو سنائی دیتی۔

وہ اس کا نام پکار رہی تھی، اتنی شدت سے گویا وہ لفظ **زندگی** ہو۔

اور پھر ایک جھلک، اور اس اس کے پورے جسم میں سویا ہوا درد جاگ گیا۔

وہ ٹھیک تھا، بالکل ٹھیک۔ گھٹنے کے بل جھکا ہوا، کسی بچے کو کچھ سمجھا رہا تھا، وہ ایلیانہ کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔

اس کے قدموں سے جان نکل رہی تھی، وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور عین اس لمحے جب وہ گرنے والی تھی، اس نے اسے تھام لیا۔

وہ ہوتا تھا، تو گرنے کہاں دیتا تھا؟

وہ ہکا بکا سا اسے گھور رہا تھا۔

اس کے چہرے پہ اور کپڑوں پہ مٹی لگی تھی، ہاتھ اور کہنیاں چھل چکی تھیں۔

وہ جو بہت پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا، یکدم اس کے قدموں کی طرف دیکھ کر مچل اٹھا تھا۔

خوشی سے۔

اس کی آنکھیں نم پڑنے لگیں، تشکر سے۔

اور ان سرمئی آنکھوں کو نم پڑتا دیکھ، ایلیانہ احمد کو یاد آیا کہ وہ اپنے قدموں پہ، بنا کسی سہارے کے کھڑی تھی۔

وہ بنا کسی سہارے کے بھاگی تھی۔

اب آنکھوں میں نمی لانے کی باری اس کی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ دونوں کبھی لب کھولتے اور کبھی بند کرتے۔

ان کے پاس وہ لفظ نہیں تھے جو ان کی کیفیات کو بیان کر سکتے۔ اور کچھ چیزیں اتنی خاص تو ہوتی ہی ہیں کہ انہیں لفظوں میں قید نہ کیا جائے۔

ان کے پیچھے سورج کئی رنگ دکھاتے ہوئے غائب ہو چکا تھا۔

روشنی کی آخری کرنیں بھی اب الوداع کہہ رہی تھیں۔ وہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی عینی شاہد بن چکی تھیں۔

●●●●●

"مجھے تمہاری مدد چاہیے!" یہ وہ میسج تھا جو اس رات داؤد عمر نے ڈیٹیکٹیو ایس کو بھیجا تھا۔

"ایک نمبر ہے، مجھے اس کی معلومات چاہیے۔"

(نمبر سے مراد نمبر استعمال کرنے والے کی زندگی کی تاریخ)

اور ابھی اسے جواب موصول ہوا تھا۔

"نمبر دو۔" داؤد کی آنکھیں چمکیں، وہ نمبر مانگ رہا تھا، مطلب تقریباً کام مکمل ہو گیا۔

وہ نمبر بھیج کر اپنی گاڑی سے باہر نکل آیا۔

ہسپتال کے داخلی دروازے پہ اسے وہ دکھی تھی، وہ مسیحا جسے دیکھ کر اس کی زندگی رک جایا کرتی تھی۔

وہ جس سے بات کرتے ہوئے وہ خوامخواہ طنز کا اضافہ کرتا تھا، صرف اس غرض سے کہ اس کی آواز دیر تک سن سکے۔

وہ جو اس کی سیاہ زندگی میں سفید ہنس بن کے بہت چپکے سے داخل ہو چکی تھی۔

وہ اندر جا چکا تھا۔

(ماریہ ہسپتال میں داخل ہو رہی تھی، جب اسے اپنی طرف بڑھتا پایا۔

اس نے فون پہ سر جھکایا ہوا تھا، اس کی چال سے بے نیازی ٹپکتی تھی۔ اس پہ جچتا تھا بے نیاز ہونا۔

اسے فون کو تکتا پا کر اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی حق سے اس کے فون کو لے کر اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ سکتی۔

"کیا یہ چند صدیوں پہلے ایجاد کیا گیا بے جان آلہ میری محبت کی آگ میں جلتی آنکھوں سے زیادہ دلچسپ ہے؟ کیا اس فون سے ملتی ساری معلومات میری باتوں کی گہرائی کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتی ہے؟"

مگر اس کے پاس یہ حق نہ تھا اور نہ ہی کبھی مل سکتا تھا۔

اور اس سوچ پہ اس کا دل چاہا کہ اچھا خاصا رو دے۔

وہ ایک انسان تھی، جس کا ایک دل تھا۔

کیا کسی کی تمنا کرنا غلط تھا؟

کیا کسی کی آنکھوں میں اپنے عکس کو دیکھنے کی تمنا کرنا اور کسی کی آواز کو سرمایہ حیات ماننا غلط تھا؟

کیا ایک شخص کے سکون کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کرنا غلط ہو سکتا تھا؟

اس نے نظریں جھکا لیں۔

وہ اس لمحے کو پچھتائی تھی جب اس نے محبت نامی آسیب کا مذاق اڑایا تھا۔)

●●●●●

اسی شام ایک لمبی سرجری کے بعد جب داؤد نے اس کی آنکھوں کے نیچے موجود حلقے دیکھتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی تو جانے کیوں اس نے یہ کہا۔

"ڈاکٹر، مجھے لگتا ہے میں ایک بہت بڑے مسئلے میں ہوں۔" اس کی سنجیدگی پہ وہ ٹھٹھکا۔

"کیا کبھی آپ نے محسوس کیا ہے کہ آپ کو بنا وجہ رونا آنے لگ جائے یا کبھی کبھی بغیر وجہ کے کندھے میں درد ہو جو سینے تک پہنچنے لگے۔ یا کبھی ہنستے ہنستے یہ احساس ہو کہ در حقیقت آپ رو رہے ہیں، آپ کی ہنسی

کھوکھلی ہے اور جذبات محض اداکاری۔ کبھی آپ نے خود کو خود سے جنگ میں مبتلا پایا ہے۔" اور جانے کیوں اس کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔

داؤد عمر نے نظریں جھکالیں۔ کون کمبخت ماریہ منصور کے آنسو برداشت کر سکتا تھا!

"میرا خیال ہے کہ آپ کو بس تھوڑا سا ڈپریشن ہے، ڈاکٹر۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ڈپریشن دینے والوں کو بھی ڈپریشن ہونے لگا ہے۔" اس نے اسے ہنسانے کی غرض سے کہا تھا۔

مگر جب وہ ہنسنے کے یا جلی کٹی باتیں سنانے کے بجائے آگے بڑھ گئی، تو اسے احساس ہوا کہ وہ غلط وقت پہ غلط بات کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال کے باغ میں موجود بنچ پہ بیٹھے تھے۔

"آپ کو ڈپریشن کی وجہ ڈھونڈنی چاہیے۔" اس نے مشورہ پیش کیا۔

"میں وجہ جانتی ہوں۔" کچھ دیر بعد جواب آیا۔

اس کے استفہامیہ انداز میں دیکھنے پر اس نے سر جھکا کر کہا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔"

"آپ بتائیں تو۔۔" خلافِ توقع وہ بضد تھا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں جل رہی ہوں، ستاروں کی طرح۔۔" اس نے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

داؤد نے نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا دیا۔

"وجہ کو مار کے حل نکل سکتا ہے۔۔" ایک صلاح تجویز کی گئی۔

"انسان کا قتل کر دوں؟" اس کی بات پہ داؤد ٹھٹھکا تھا۔

پر وہ کسی ٹرانس کے زیر اثر بولتی گئی۔

"وہ بھی اس انسان کا جسے نہ دیکھوں تو لگتا ہے کہ دن نہیں گزرے گا۔۔" اس بات پہ وہ کھانسنے لگا تھا۔

اتنی اچانک، کہ اسے اپنے بیگ سے پانی نکال کر اسے دینا پڑا۔

"کیا اس انسان کا نہ ہونا مسئلہ ہے؟" اور یہ پوچھتے ہوئے اس کے دل پہ کتنے خنجر چل رہے تھے، یہ وہی جانتا تھا۔

"شاید اس کا ہونا مسئلہ ہے۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"مطلب؟" اور اس بات پہ وہ چڑ گئی۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اور وہ کھڑے ہو کر چلانے لگی۔

"مطلب؟ مطلب آپ خود کیوں نہیں سمجھ لیتے؟ بہت ذہین ہیں نا آپ تو، ایم بی بی ایس آپ نے کر رکھا ہے، کمپیوٹر کے متعلق سب آپ کو پتا ہے، اور اتنی سادہ سی بات کا مطلب پوچھتے ہیں۔

بڑے آئے ڈاکٹر، کسی کی آنکھیں پڑھنی تو آتی نہیں ہیں، بیماروں کا علاج کروالو۔

کسی کی بات میں چھپا مطلب سمجھ سکتے نہیں، بڑی بڑی پہیلیاں سلجھوالو۔" اور جب وہ چیختے چیختے ہانپنے لگی تو وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

داؤد وہیں بیٹھا، اس کی بات پہ غور کرتا رہ گیا۔

شام میں اسے گم سم سا دیکھ کر عالیان نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے بہت دھیمے سے کہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے۔۔۔ اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔" اس کی حالت ایسی تھی گویا موت کے منہ میں کھیل رہا ہو۔

گویا جسم کاٹو تو خون کی جگہ غم نکلے گا۔

"کس سے؟" عالیان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا، گویا تسلی دینی چاہی ہو۔

"میں نہیں جانتا۔۔"

اور ماریہ منصور ٹھیک کہا کرتی تھی۔

آنکھیں تو اسے پڑھنی آتی نہیں تھیں، مریضوں کا علاج وہ خاک کرے گا۔

("میں اقرار کر چکی ہوں۔" یہ میسج نہیں بم تھا، جو اس نے آنا کے سر پہ پھوڑا تھا۔

"کیا؟؟؟ کب، کیسے؟؟" اور اس لڑکی کے پاس سو سوال تھے۔

جن میں سب سے زیادہ بار پوچھے جانے والا سوال تھا۔

"اس نے کیا کہا؟"

جس پہ ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اتنا ذہین نہیں ہے، کہ میری بات کا مطب، یا میری آنکھ کا اشارہ سمجھ لے۔ جتنی بھی ڈگریاں لے لے، محبت سمجھنی نہیں آتی اسے، آنا۔۔" اور یہ کہتے ہوئے اسے پھر رونا آ رہا تھا۔

اور غصہ بھی، شدید غصہ۔)

"ہو سکتا ہے وہ شخص تم ہو؟" عالیان کے کہنے پہ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس کی معصومیت کو میری سیاہی داغ دار کر دے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ خوبصورت آنکھیں میرے لیے آنسو بہائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہنس کو بھیڑیے سے محبت ہو جائے۔" اس کی آواز شکستہ سی تھی۔

ایسی آواز جس پہ محض ترس کھایا جا سکتا ہو۔

"فرض کرو، ایسا ہو گیا تو۔۔"

"فرض کروں؟" وہ چلایا۔ "ہر نماز کے بعد دعائیں کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ میرے سائے تک سے محفوظ رہے۔۔ اور تم کہہ رہے ہو، داؤد عمر، فرض کرو کہ ایسا ہو جائے۔" وہ حد سے زیادہ بے بس محسوس

کر رہا تھا۔ عالیان نے اسے عرصے بعد اتنا اداس دیکھا تھا۔

اس پہ لازم تھا کہ اس کے غم میں اداس ہو جاتا۔

●●●●●

اس کی سرمئی آنکھوں میں اس کی یونیورسٹی کا عکس تھا، جس کی جانب وہ بڑھ رہا تھا۔ کئی دنوں بعد اس نے یہ ہمت اکٹھی کی تھی کہ یونیورسٹی کا سامنا کر سکتا۔

وہاں موجود لوگوں کا سامنا کر سکتا۔

یہ سچ تھا کہ وہ لوگ اسے haunt کرتے تھے۔

وہ اسے بلی کرتے تھے، اور وہ ہر بار ان کی باتوں سے اثر انداز ہوتا تھا۔

کئی کئی دن ڈپریشن میں گزار دیتا۔

وہ کہتے کہ تم کسی کام کے نہیں ہو تو وہ ان کی بات ٹالنا چاہتا مگر وہ اس بات کو اتنی بار دہراتے کہ اسے یقین آنے لگتا کہ وہ بے کار ہے۔

وہ گالیاں دیتے تو اس کا دل دہل جاتا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ اسے ڈراتے تھے اور وہ ڈر جاتا تھا، مگر آج نہیں۔

اب اور نہیں!

وہ آگے بڑھ رہا تھا، جب ایک لمبے سے لڑکے نے اس کا راستہ روکا۔

"تو تم آ گئے، (گالی)!" وہ اتنی اونچی آواز میں بولا کہ ارد گرد موجود ہر شخص نے مڑ کر دیکھا۔

عیسی خلافِ توقع مسکرایا۔

("جانتے ہو ڈرانے والوں کی غذا کیا ہے؟" یہ داؤد تھا، جو اسے کافی مارنے کے بعد اب تمیز سے بات کرنے پہ اکتفا کر رہا تھا۔

"تمہارا خوف!" اس نے خود ہی جواب دیا۔

"تمہارے آگے موت بھی کھڑی ہو، اور تم رونے کے بجائے مسکرا دو نا، تو چند لمحوں کے لیے تو موت بھی بوکھلا جائے، وہ تو بس انسان ہیں۔")

"مسکرانا سیکھ لیا ہے اس بر گرنے۔۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کو ایسے انداز میں بتایا کہ قہقہے گونجنے لگے۔

"تم جیسا ذلیل اور کم ظرف شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔۔" وہ بولتا گیا۔

اس کی بات کے اختتام پہ عیسی اس کی آنکھوں میں جھانک کر، تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔

"ہو گیا؟" اس کے ہر انداز سے بے نیازی جھلک رہی تھی۔

("ان کو خود پہ بہت اعتماد ہے نا، انہیں احساس دلاؤ کہ تمہیں ان کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔۔ ان کی خود اعتمادی کو کچل دو۔" وہ سفاکی سے کہہ رہا تھا۔)

اب اس لڑکے کی بھی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ کا مکا بنا کر اس کے منہ پہ دے مارا۔ ایک لمحے کے لیے وہ لڑکھڑایا تھا، اس کے سامنے دنیا گھوم کے رہ گئی مگر پھر وہ ان پہ ٹوٹ پڑا تھا۔

اسے ٹریننگ دینے والے بھی کوئی عام غنڈے تھوڑی تھے۔

("اور اگر انہوں نے مجھے مارا تو۔۔" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ تمہیں ایویں تو پاپا کی پری نہیں کہتے۔ تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ وہ تمہیں ماریں تو تم بھی انہیں مار دینا۔

وہ ایک تھپڑ ماریں، تم دو مارنا۔ وہ ایک مکا ماریں تم ہاتھ توڑے بنا نہ آنا۔" وہ کہہ کر کندھے اچکا چکا تھا۔

اور عیسی بس سوچ کر رہ گیا کہ وہ کیا کر سکتا تھا۔)

وہ چار تھے، اور یہ ایک۔

کافی دیر تک اس نے ہمت سے مقابلہ کیا، اور پھر جب اس کی بس ہو گئی، اس نے دیکھا کہ کوئی آیا تھا۔

کوئی جس کے دو مکے کھانے کے بعد وہ لوگ بھاگ رہے تھے۔

"آئندہ تم لوگوں نے اسے ہاتھ لگانے کی جرات کی، تو تم لوگوں کے ہاتھ میں نہیں پولیس والے توڑیں گے۔" وہ للکارا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ دھمکی تھی۔ اور ایک وکیل اور ڈاکٹر کی دھمکی سے ڈرنا لازم ہوتا ہے۔

دونوں ہی میں "جان" کا خطرہ ہوتا ہے۔

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دینا چاہا۔

عیسی اس کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اٹھتے ہی اس نے اسے گلے لگا لیا۔

"مجھے تو لگا آج میرا آخری دن ہے۔۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"حد ہے، عیسی۔ کیا فائدہ تمہارا میرے اور داؤد سے سیکھنے کا جب تم چار لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔" اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

تھا تو وہ داؤد کا بھائی، طنز کرنا اس کے خون میں تھا۔

اب وہ دونوں گھر جا رہے تھے۔

بالآخر عیسی اپنی یونیورسٹی میں بنا کسی خوف کے آ سکتا تھا۔

یہ اس کا خیال تھا۔۔

یہ اس کا گمان تھا۔

●●●●●

ماضی کی عمارت سے آتی گلوگیر آوازیں حال کا جینا حرام کر رہی تھیں۔

کوئی چلا رہا تھا، کوئی رو رہا تھا۔ ماتم کر رہا تھا۔

کسی کی خوشیوں کا انتقال ہو چکا تھا۔

"مجھے لگتا تھا کہ تم کبھی بھی مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔

میں نے تم پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔" وہ اس سے زیادہ خود کو بتا رہی تھی۔

وہ خود کو جتا رہی تھی۔

"میں نے تم سے اتنی محبت کی، شازم۔۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے بہترین دوستوں کو چھوڑا۔ میں نے تمہاری خوشی کے لیے اپنی بہن کو چھوڑا۔ میں نے تمہارے لیے اپنے بھانجے کو چھوڑ دیا، شازم۔ وہ مر گیا

تھا، شازم۔ میں نے تمہارے لیے اسے مار دیا۔" اس کے بارہا یہی جملہ دہرانے پہ شازم کا صبر جواب دینے لگا۔

"اوہ کم آن آئرہ۔ تم نے اپنے بھانجے کو نہیں مارا۔ نکل آؤ اس صدمے سے۔" وہ اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے بہت نرمی سے بول رہا تھا۔

"تم مجھے کیسے چھوڑ سکتے ہو، شازم؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

"تم کسی اور کو ہمارے درمیان کیسے لا سکتے ہو، شازم؟" وہ بچوں کی طرح سسک رہی تھی۔

وہ منتیں کر رہی تھی۔

اس کی بات پہ شازم یکدم چلایا تھا۔

"حد ہے، آئرہ۔۔ نہیں ہے کوئی ہمارے درمیان۔ اپنے شازم پہ یقین رکھو۔۔" اس نے التجا کی تھی۔

اس کے الفاظ کھوکھلے تھے، اس کے وعدوں کی طرح۔

"یقین ہی نے تو مار دیا ہے، شازم۔۔" اس کی آنکھیں نیم مردہ تھیں۔

"میں نے محبت میں تمہیں ہی سب مانا تھا۔ میں نے تم پہ اندھا یقین کیا، شازم۔۔" وہ سسکی۔

"اس لیے کہ تم مجھے اندھا ثابت کر دو؟ اسے لیے کہ تم میری کمر میں خنجر گھونپ دو؟ میں نے تمہیں زندگی مانا تھا، اس لیے کہ تم مجھے مار دو؟" وہ بچوں کی طرح روتی گئی۔

شازم نے اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں تھاما۔

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، آئرہ۔۔" وہ اس کی باتوں میں آ رہی تھی، لیکن یکدم آئرہ کو لوہے کی سی ٹھنڈک اپنی گردن پہ محسوس ہوئی تھی۔

اس نے سہم کر اپنی محبت کو دیکھا جو اس پہ بندوق تانے کھڑی تھی۔

اسے لگا وہ مر چکی ہے۔

اس کا دل چاہا کہ چلائے اور کہے کہ

"بندوق چلا کر گولی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شازم حمزہ۔

تم مجھے پہلے ہی مار چکے ہو۔"

مگر وہ تو اس سے بندوق چھین رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اسی پہ بندوق تانے کھڑی تھی۔

"محبت میں شرک کی سزا جانتے ہو، شازم؟ موت، فقط موت!" وہ چلائی۔

اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

یہ وہ کیا کر رہی تھی؟

اس نے ایک بار شازم کو دیکھا اور پھر بندوق کو۔

اس کا دل چاہا کہ خود کو مار لے۔

اس نے۔۔ اس نے محبت کو مارنے کا سوچ بھی کیسے لیا۔

اس نے بندوق کو ایک طرف پھینک دیا۔

"آئی ایم سوری، شازم۔" اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

"میں نے آپ پہ بندوق کیسے تان لی۔" وہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے گلے سے لگ کر اپنا غم

اس سے بانٹ لینا چاہتی تھی۔

اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔

اسے یہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو سمیٹ لے۔

وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ اس تک نہ پہنچ پائی۔

بندوق چلنے کی آواز نے ہر شے کو ساکت کر دیا۔

وہ ڈھے چکی تھی۔ اور اس کے ارد گرد خون پھیل رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند ہونے سے قبل اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹکرائی تھیں۔ ایک آخری بار ٹکرائی تھیں۔

آج ان کے درمیان کرب تھا، کسک تھی، ملال تھا، پشیمانی تھی، غم تھے، اور کہیں بہت نیچے، دل کی گہرائیوں میں چھپی بے تحاشا محبت بھی تھی، جو دفن ہو گئی تھی، پہلے سے زیادہ شدت اختیار کرنے کے لیے۔

وہ گھائل سا مسکرائی۔ اور قاتل کو احساس ہوا کہ وہ تو خود کو مار چکا ہے۔

اور پھر ہوش نے ساتھ چھوڑ دیا۔

آئرہ حسن کی محبت نے اسے مار دیا تھا۔

اس دن، تاریخ بدلی۔

عاشق نے محبوب کا قتل کر ڈالا۔

اس شخص نے خود غرضی کی داستان رقم کر دی تھی، وہ بھی اپنے محبوب کے خون سے۔

اس دن، دنیا میں موجود ہر ذرہ اداس تھا۔ کیوں کہ وہ صرف ایک انسان کا نہیں، بلکہ "محبت" کا قتل تھا۔

ہر سو پھیلتا خون اپنے اندر اتنا غم سمائے ہوئے تھا، اور اس سرخ سیال کا ہر قطرہ ایک ہی داستان سنا رہا تھا کہ۔

"محبت محض موت ہے!"

●●●●●

رات اپنے پر دے پھیلائے ہوئے تھی، لوگ نیند کی آغوش میں بیٹھے سکون کی لوریاں سن رہے تھے۔

وقت تھا، تین پچیس۔ یعنی آدھی رات کا وقت۔

اس وقت اس کا فون بجا، اسے شدید غصہ آیا تھا۔

مگر فون اٹھاتے ہی وہ سکوت کا شکار ہو گیا۔

کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بچوں سے دشمنی نبھانا اچھا نہیں لگتا، داؤد عمر، پر تم نہ رکے، تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔۔" وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔

اس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

وہ اس کے نام کو عجیب طریقے سے ادا کرتا تھا۔

عجیب تلفظ تھا اس کا۔

فون کٹ چکا تھا، اور وہ اے سی کی سرد ہوا کے باوجود پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔

بہت اندر، دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا بچہ اب بھی موت سے ڈرتا تھا۔

اس نے یہ نمبر بھی ڈیٹیکٹیو کے نمبر پہ بھیج دیا۔ اور پھر۔۔ اور پھر وہ سو نہ سکا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

اس کی رات برباد ہو چکی تھی۔

●●●●●

اس دن اس نے جتنا ممکن تھا، اتنا اسے نظر انداز کیا۔

مگر۔۔۔ وہ اسے کتنا نظر انداز کر سکتی تھی؟

دل سے گرا تو نہیں سکتی تھی نا؟ یہ تو اس کے اختیار میں نہ تھا۔

شام کو، اس نے اسے اپنی طرف آتا دیکھا۔

وہ اس کی طرف سینڈوچ بڑھا رہا تھا۔

اس نے اسے گھورا تو اس نے کندھے اچکا کے کہا۔

"میں جانتا ہوں آپ صبح سے بھوکی ہیں، ڈاکٹر۔۔ اسی لیے آپ کا دماغ کام کرنا چھوڑ چکا ہے۔" اس نے بنا کچھ کہے سینڈوچ تھام لیا۔ بھوک تو اسے واقعی بہت لگی تھی۔

وہ دونوں پھر اسی بنچ پہ جا بیٹھے تھے۔

"عام طور پہ لوگ میرے ہاتھ سے بنی چیز کھانے کے بعد تعریف کیے بنا نہیں رہ پاتے۔ لیکن چوں کہ میں جانتا ہوں آپ ٹھیک نہیں ہیں، تو چلیں آپ کو معاف کیا۔" اور ان دونوں نے ہی یہ بات محسوس کی تھی کہ وہ زیادہ ہی بولنے لگا تھا۔

"ویسے کون ہے وہ بدنصیب؟ جسے آپ نے چاہا ہو گا؟ مجھے تو سوچ سوچ کے ہی کچھ ہو رہا ہے کہ وہ کیسے زندگی گزارے گا۔" وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ اسے اپنے رقیب کا نام جاننا تھا، اس شخص کا نام جاننا تھا جس نے اسے پوری رات سونے نہیں دیا۔

جو اس کے خوابوں میں آ کر بھی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"تمہارے درد کی دوا کو تم نے خود کھویا ہے۔"

اور اسی پل داؤد کو احساس ہوا کہ وہ پھر غلط وقت پہ غلط بات کہہ چکا تھا کیوں کہ اس کی آنکھیں نم پڑنے لگی تھیں۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔" شاید زندگی میں پہلی بار اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

"میں بس متجسس تھا۔۔ کیا آپ نے اقرار کر دیا، ڈاکٹر؟" اور اس کی بات سن کر ماریہ کا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دے۔

"جی ہاں۔ مگر وہ شخص اندھا ہے اور بہرا بھی۔۔ وہ کبھی نہیں سمجھ پائے گا کہ میں اقرار کر چکی ہوں۔ وہ

جاہل ہے، اس کے پاس صرف بڑی بڑی ڈگریاں ہیں، آنکھیں پڑھنے کا ہنر نہیں۔۔"

اور اس کی بات پہ داؤد ساکت ہو گیا۔

کتنا بدبخت تھا نہ وہ، جو محبت کو دماغ سے کھیل رہا تھا۔

اس محبت کو جس کے آگے اچھے اچھوں نے دل ہارا تھا۔

جس نے اچھے اچھوں کو مار ڈالا تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ آپ کی بات سمجھ گیا ہو۔۔" وہ نہیں جانتا تھا اس نے یہ کیوں کہا۔

شاید وہ ایک رات بھی رقیب کے خیال کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔

اب ساکت ہونے کی باری ماریہ کی تھی۔

اسے لگا کسی نے اس کا دل کسی شکنجے میں دبوچ دیا ہو۔

"یعنی۔۔" سانس حلق میں اٹک گیا۔ "یعنی، اسے مجھ سے محبت نہیں ہے؟" اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھ رہی تھی۔

اب سانس تھمانے کی باری داؤد عمر کی تھی۔

"ہو سکتا ہے اسے آپ سے محبت ہو۔۔ اور اسے محبت ڈراتی ہو۔"

"وہ "محبت کے خوف" سے ڈر گیا ہے، اور ایک میں ہوں جو جل جل کے راکھ ہو گئی ہوں پھر بھی ڈٹ کے کھڑی ہوں۔۔"

"کیا تکلیف ہو رہی ہے؟" جانے کیوں وہ یہ پوچھ بیٹھا تھا۔

"بہت زیادہ۔۔" یہ کہہ کر اس نے سر ہاتھوں کے پیالے میں گرا دیا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس شخص کو مار دوں۔" اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔

اس نے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیے اور اس کی طرف دیکھ کے کہا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"وہ مر گیا، تو میں کیسے جیوں گی؟" اور داؤد عمر کا دل چاہا کہ زمین چاک ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

اس کے اندر جینے کی اگر کوئی تمنا تھی، تو وہ اس لڑکی کا دل دکھا کر ختم ہو چکی تھی۔

کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھے رہے، پھر ماریہ کے دل نے ایک فتوی جاری کیا۔

اس نے خود کو کہتے سنا۔۔

"آئی ایم سوری، سر۔ آئیندہ آپ کو میری طرف سے غیر پیشہ وارانہ رویہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ امید ہے آپ میری غلطی کو معاف کر دیں گے۔" اور وہ اٹھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی ویران تھیں کہ داؤد کو ان سے خوف آیا۔

اس نے جو بھی کہا، داؤد کو صرف یہی سنا۔

"میرے دل نے غلط انتخاب کیا ہے۔ کوئی بزدل اس قابل نہیں کہ میں اس کی خاطر ذلیل ہوتی رہوں۔۔ مجھے جلنا قبول ہے، مگر اس شخص کا ساتھ نہیں جو محبت کو دماغ سے کھیلتا ہو۔"

اسے لگا کسی نے اس کے منہ پہ زوردار طمانچہ مارا ہو۔

کسی نے اس کی عقل پہ تھوک دیا ہو۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ کسی "وہ" خود تھا۔ اس نے محبت کو اپنے ہاتھوں جانے دیا تھا۔

پھر وقت گزرتا گیا اور اس نے ایک بار بھی "کسی غیر پیشہ وارانہ بات" کا ذکر نہیں کیا۔

اس نے کہا تھا وہ جل رہی ہے، وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے اقرار کے بعد وہ کتنی مرتبہ مرا ہے۔

مگر، نہ اس میں بہادری تھی اور نہ ہی وہ اس قابل تھا۔

●●●●●

جولائی کے مہینے کی ایک دوپہر، وہ تینوں ایک ہی گاڑی میں سفر کر رہے تھے، جب عیسی نے اپنی بوریت

سے تھکتے ہوئے ریڈیو چلا دیا۔

یکدم وہ آواز گونجنے لگی، جو ان تینوں کو جانے کہاں لے گئی تھی۔ وہ گانا کسی پرانے وقت کی یادگار تھا۔

"شمع جو جلائی ہے میری وفا نے

بجھانا بھی چاہو، بجھا نہ سکو گے"

گاڑی کو چلاتے ہوئے اسے یکدم کسی کی محبت میں جلتی سبز آنکھیں بہت یاد آئی تھیں۔

اتنی یاد کہ اسے دل میں درد کی لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو

مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے۔۔"

پیچھے بیٹھے لڑکے کو بھی کسی کی دلکش کتھئی آنکھوں کی بے تحاشا یاد آئی تھی۔

کتنا مشکل ہے نا کسی ایسے کو چاہنا جسے پانا ممکن ہو نہ دو پل سکھ سے دیکھنا۔

"نہ جانے کیوں مجھ کو یقیں ہو گیا ہے

میرے پیار کو تم بھلا نہ سکو گے"

اور اسے سن کر سرمئی آنکھوں والا لڑکا مسکرایا۔

وہ تینوں ہی اثیرِ محبت تھے۔

اب داؤد نے چڑ کر ریڈیو بند کر دیا۔ ہاں، وہ اب بھی بھاگتا تھا، اپنے اصل سے۔

اپنی محبت سے۔

"عیسی، تمہیں زیادہ ہی یاد نہیں آ رہی اس کی؟" یہ اس کی بھراس تھی جو اب عیسی پہ نکلنی تھی۔

عیسی مسکرایا۔ ان دو سالوں میں اس نے ان دو نمونوں سے کم از کم دو ٹوک جواب دینا تو سیکھ ہی لیا تھا۔

"کم از کم میں مانتا تو ہوں کہ مجھے محبت ہے، بزدلوں کی طرح چھپتا تو نہیں ہوں نا۔۔" داؤد اس لمحے کو پچھتایا جب وہ اس کے منہ لگا تھا۔

"ویسے بزدلی صرف محبت سے نہیں، محبوب سے چھپنے کو بھی کہتے ہیں، عیسی۔" یہ آواز عالیان کی تھی۔

عیسی تلملا کر رہ گیا۔

اب وہ اپنی منزل تک پہنچ گئے تھے۔

یہ اب ان کا معمول تھا کہ وہ ایک دوسرے کو "لڑنا" سکھایا کرتے تھے۔

اور وہ اڈا ان کا ٹریننگ سینٹر تھا۔

مگر آج ان کا "سرپرائز ٹیسٹ" تھا شاید۔

سامنے کچھ لوگ، جنہیں عالیان اور داؤد اچھی طرح پہچانتے تھے، ہاتھوں میں ڈنڈے لیے کھڑے تھے۔

یہ وہی لوگ تھے جن سے عالیان اور داؤد نے پین ڈرائیو چرائی تھی۔

"ارے یار بنٹی (نام تو اسے معلوم نہ تھا، سو جو ذہن میں آیا، بول دیا۔) تو تھکتا نہیں ہے ہم ہی سے لڑ لڑ کے؟" یہ عالیان کی آواز تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

داؤد نے عیسی اور عالیان کو گاڑی کی طرف جانے کا اشارہ کیا تھا، کیوں کہ وہ معاملے کی سنگینی سے واقف تھا۔

اس وقت ان کے آگے چار غنڈے تھے، وہ بھی اسلحہ کے ساتھ۔

مگر ان دو بے وقوفوں نے جب تک اشارہ سمجھا تب تک وہ غنڈے بھی سمجھ چکے تھے۔

وہ باہر سڑک کی طرف بھاگے تھے۔

لیکن مخالف حملہ شروع کر چکا تھا۔

پہلی دفع داؤد کو اس جگہ کا سنسان ہونا برا لگا تھا۔

وہ ڈنڈوں کے ساتھ لڑ رہے تھے تو کیا ہوا؟ ان کے خون میں بھی انتقام کی طاقت بھڑک رہی تھی۔

اب وہ تینوں بھی جوابی حملے کر رہے تھے۔

بنٹی اب عالیان کی طرف متوجہ تھا، عالیان نے اس پہ وار کیا، اور ڈنڈا لینا چاہا۔ اس نے وہی ڈنڈا پوری قوت سے اس کے کندھے پہ مارا۔

داؤد کے گرد دو لوگ تھے۔ وہ ایک سے ڈنڈا لے چکا تھا، اور دونوں کو ہی مار رہا تھا۔

شاید وہ جیت بھی جاتا اگر ان میں سے ایک نے ڈنڈا اس کے سر پہ نہ دے مارا ہوتا۔

عیسی نے دو مکے مارنے کی کوشش کی اور جواباً چار دفعہ ڈنڈے کھائے، اس کا حقیقی غصہ تب جاگا جب اس نے داؤد کو گرتا دیکھا تھا۔

وہ شاید غصہ تھا، شاید خوف، جو بھی تھا، اسے طاقت دے گیا۔

اس نے مقابل سے ڈنڈا لے کر ایک طرف کو پھینکا، اور اس پہ پہ در پہ کئی حملے کیے۔ وہ اس پہ مکے برساتا گیا حتی کہ اسے اپنے ہاتھ پہ اس شخص کے خون کا سرخ رنگ دکھنے لگا۔

اس کی رفتار کم ہوئی مگر وہ رکا نہ تھا۔

اب منظر کچھ یوں تھا کہ وہ اس شخص پہ بیٹھا اسے مارتا جا رہا تھا۔

جب اسے تسلی ہو گئی کہ وہ شخص نہیں اٹھے گا تب وہ داؤد کی طرف بڑھا تھا۔

داؤد کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا، تو ڈنڈے ان غنڈوں کے ہاتھ میں بھی نہیں رہے تھے۔

اب عیسی اور داؤد مل کر ان دونوں کو مار رہے تھے۔

عالیان بھی ابھی بنٹی کے اوپر بیٹھا اسے مار رہا تھا جب اس نے محسوس کی کسی کی مضبوط گرفت اپنی گردن کے گرد۔

وہ وہ چوتھا شخص تھا جسے عیسی نے زخمی کیا تھا۔

اور وہ اس کا گلہ دبا رہا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

عالیان نے اسے پکڑنا چاہا، اسے مارنا چاہا مگر اب بنٹی اس کے پیٹ پہ مکے مار رہا تھا۔

اسے سانس تھمتا محسوس ہوا۔ اسے موت سامنے نظر آئی۔

دل رک رہا تھا شاید، مگر آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے سے قبل اس نے محسسوس کیا کہ وہ بلآخر اسے چھوڑ چکا ہے۔

وہ دوہرا ہو کے کھانسنے لگا۔

اسی لمحے بنٹی نے ایک تیز دھار چھڑی نکالی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے شخص نے عالیان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے اس کے جسم میں وہ آلہ نہیں گھونپا، بلکہ وہ اس چھڑی کو اس کی گردن تک لے آیا۔

وہ مزاحمت کر رہا تھا، مگر سب بے سود تھا۔

اسے وہ چھڑی اپنے جسم میں گھستی محسوس ہوئی، ایک معمولی کٹ جو شاید بڑے زخم میں بدلنے والا تھا۔

مگر موت کو ابھی وہ اتنا بھی عزیز نہیں ہوا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

عیسی نے ڈنڈے سے بنٹی کے سر پہ وار کیا تھا۔

اب وہ اس پہ ڈنڈے برسا رہا تھا۔

داؤد ایک آدمی سے لڑ رہا تھا، اور ایک بے ہوش پڑا تھا۔

عالیان نے اس شخص پہ مکے برسانے شروع کیے جو اسے پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

بنٹی اب تقریبا بے ہوش ہو چکا تھا۔

عالیان جس شخص سے لڑ رہا تھا، اس نے عالیان کو گرا دیا اور وہ سڑک پہ گری چھڑی اٹھا کر عیسی کی طرف بڑھا تھا۔

اس نے وار کرنا چاہا، مگر نشانہ چوک گیا۔

اس کے بازو پہ کٹ لگا تھا جس سے اب خون بہہ رہا تھا۔

عیسی نے ڈنڈے کا رخ اس شخص کی طرف کر لیا۔

"گھٹیا انسان، میری ماں نے مجھے کبھی کچن میں نہیں جانے دیا کہ کہیں مجھے چوٹ نہ لگ جائے اور تو نے مجھے اتنا بڑا کٹ بنا کسی وجہ کے لگا دیا؟" وہ معصومیت سے بولتے ہوئے اب اسے ڈنڈے سے مار رہا تھا۔

عالیان عیسی کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ وہ ان سے کافی کچھ سیکھ چکا تھا۔

مگر بنٹی کو اٹھتا دیکھ اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

وہ بنٹی سے پہلے اس چھڑی تک پہنچ چکا تھا۔

اور دفاع کے چکر میں بنٹی کے کندھے میں وہ چھڑی گھونپ چکا تھا۔

داؤد اس وقت پھر دو لوگوں سے لڑ رہا تھا۔

کمبخت ٹھیک سے بے ہوش ہی نہیں ہوتے تھے۔

گاہے بگاہے وہ ان دونوں کی طرف بھی دیکھتا۔

وہ ان کا بڑا بھائی تھا۔ ان کی حفاظت اس پہ فرض تھی۔

جب ان سب نے بنٹی کو دیکھا، ان سب نے لڑنا بند کر دیا، وہ سب بنٹی کی طرف بڑھے تھے۔

یہ ماجرا عجیب تھا۔

وہ سب ایک طرف کو بھاگ رہے تھے۔

یہ لوگ بھی ان کی جانب بھاگے مگر وہ اپنی جیپ کو چلا چکے تھے۔

وہ دونوں حیران تھے۔

عیسی نے مسکرا کر کہا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"لگتا ہے مجھ سے ڈر گئے تھے!" اس عجیب سی صورتحال میں بھی داؤد مسکرا دیا۔

وہ دونوں بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔

یکدم داؤد کے ابرو سکڑے۔

"عالیان کہاں ہے؟" اور عیسی کی بھی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

وہ دونوں سڑک کی طرف بڑھے تو وہ ایک طرف کو اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

داؤد نے فوراً اسے سیدھا کیا۔

اس کے گردن کے زخم کو چھوا۔

ایک معمولی سا کٹ، اسے اس کی بے ہوشی کا سبب سمجھ نہ آیا۔ اور پھر اس کی توجہ اس کے ناک سے نکلتی خون کی باریک لکیر نے کھینچی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پہ تکلیف کے آثار اب تک تھے۔

"عالیان بھائی؟" عیسی کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔

"انہیں کیا ہوا ہے؟" وہ داؤد کو جھنجھوڑ رہا تھا، جو اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔

اس کی نبض دھیمی تھی۔

داؤد نے عیسی کی طرف دیکھا، تو اس کی آنکھیں خوف سے اور کھل گئیں۔

وہ اپنی گردن کو پکڑ کر سانس لینے کی سعی کر رہا تھا۔

"عیسی؟" اس نے اسے پکارا، جو بری طرح کھانس رہا تھا۔

اس کی نگاہ اس کے بازو کے کٹ تک گئی، اور وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔

ان دونوں کو زہر دیا گیا تھا!

وہ عیسی کو سہارا دے کر گاڑی تک لے کے گیا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ عالیان کو اٹھا رہا تھا۔

آدھے گھنٹے کے سفر کو پندرہ منٹ میں طے کرتے، وہ ہسپتال پہنچ چکا تھا۔

ان دونوں کو آئی سی یو میں لے گئے تو اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

وہ زخمی تھا، درد میں تھا، اور بے بس اور پشیمان بھی۔

وہ دیوار کے ساتھ لگ کر وہیں زمیں پہ بیٹھ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد شناسا آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس نے سر اٹھایا۔

وہ حد سے زیادہ ٹوٹا ہوا تھا۔

اس کی گھائل و سرخ آنکھیں ماریہ منصور کے دل میں کھب گئیں۔

پھر ماریہ نے اس کے سر سے بہتے خون کو دیکھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ حد سے زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اور اس کے سوال پہ داؤد نے آئی سی یو کی طرف دیکھا۔

ماریہ آگے بڑھی، اور دور سے بھی وہ اس کے بھائی کو پہچان گئی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

معاملے کو سمجھتے ہوئے وہ اس تک آئی۔

اسے رونا آ رہا تھا۔

اگر وہ کہتی تھی کہ اس کی محبت مر چکی ہے، تو اس شخص کو زخمی حالت میں دیکھ کر اس کا یہ گمان ختم ہو گیا تھا۔

"اٹھیں۔ پلیز زاپنی مرہم پٹی کروائیں۔ آپ ڈھے جائیں گے تو۔۔ تو میں کیا کروں گی؟" اور بالآخر اس نے یہ کہہ دیا۔

نہ صرف کہا بلکہ آنسو بھی بہانے لگی۔

اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور اٹھتے ہوئے وہ لڑکھڑایا، کافی زیادہ مار کھالی تھی آج اس نے۔

لڑکھڑا کے آگے بڑھتے ہوئے، دیوار کا سہارا لیے، وہ پیچھے مڑا اور گھائل سا مسکرا کر بولا۔

"آپ روتی ہیں تو میری تکالیف میری برداشت سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ آپ رویا مت کریں۔ مجھے آپ کے آنسو اچھے نہیں لگتے۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

ماریہ تھم گئی۔

اس کے بہتے آنسو رک گئے۔

اگلی بار اس نے اسے سر پہ بڑے سے بینڈیج کے ساتھ دیکھا تھا۔

عالیان اور عیسی کو زہر دیا گیا تھا، مگر وہ اتنا زہریلا نہیں تھا۔

افسوس، ابھی موت ان پہ اتنی مہربان نہیں تھی۔

ایک دن بعد ان دونوں کو ہوش آ گیا تھا، اور تیسرے دن وہ ہسپتال کے بجائے داؤد کے اپارٹمنٹ میں تھے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

●●●●●

وہ اس وقت کچن میں تھا جب نوٹیفیکیشن کی آواز پہ چونکا۔

میسج دیکھ کر اسے اپنی گردن کی نسیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔

"چاہتے ہو تم کہ تمہارا حشر بھی تمہارے باپ کی طرح ہو یا تمہاری ممانی کی طرح؟ اور شدید طیش کے عالم میں اس نے وائس نوٹ ریکارڈ کرنا شروع کیا۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے موت سے ڈر لگتا ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ تم دیکھنا، مر بھی گیا تب بھی تمہیں نہیں بخشوں گا۔ تمہاری زندگی حرام کیے بنا نہیں مروں گا۔" وہ وائس نوٹ بھیج کر پیچھے مڑا تو اس نے دیکھا کہ

عیسی آنکھوں میں مایوسی کیے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، عیسی اس کا فون لے چکا تھا۔

سارے میسج دیکھنے کے بعد اس نے شکستہ سی آواز میں کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ یہ مذاق ہے۔۔"اس کی آواز نحیف سی لگتی تھی۔

"آپ نے کہا کہ اب آپ کو ایسے میسج نہیں آتے۔۔"داؤد نے جواباً بولنا چاہا مگر اس نے بات کاٹ دی۔

"آپ نے جھوٹ کہا تھا، کیوں کہ آپ بہت زیادہ خود غرض ہیں۔۔وہ جو شخص اندر بیٹھا ہے نا جس میں اب تک دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہیں آئی، اسے بھنک بھی لگی نا ان دھمکیوں کے بارے میں تو وہ ایک بار تو جیتے جی مر جائے گا۔۔"اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔

"آپ اتنے بزدل ہیں کہ اپنے آپ کو اس ڈر سے تنہا کر دیتے ہیں کہ اپنوں کو کھونا نہ پڑے۔اور جو آپ کو چاہتے ہیں، ان کا کیا؟"وہ چلا رہا تھا۔داؤد نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

"بہت آسان ہے آپ کے لیے یہ کہنا کہ میرے جنازے کو کندھا تم دو گے۔کبھی یہ سوچا کہ کندھا دینا پڑ گیا تو عالیان اور عیسی کا کیا بنے گا؟ کبھی یہ سوچا کہ ان کی تو کمر ٹوٹ جائے گی؟ وہ زندہ ہو کے بھی مر جائیں گے؟

کبھی اپنے ماموں کا سوچا جو اپنے بیٹے سے زیادہ توجہ آپ کو دیتے ہیں، صرف اس غرض سے اپنے بیٹے سے دور رہتے ہیں کہ آپ کو محبت کی کمی محسوس نہ ہو؟

کبھی اس لڑکی کا سوچا جو آپ کو اداس دیکھ کر رو دیتی ہے؟ وہ لڑکی جس کی محبت کی تذلیل کی آپ نے، مگر وہ پھر بھی آپ کی سلامتی چاہتی ہے؟"وہ بول بول کر ہانپنے لگا تھا۔

"عیسی، ہم بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔۔"اس کے یہ کہنے پر عیسی کا تنفس تیز ہونے لگا۔

اس نے بات جاری رکھی۔

"نہیں، آپ یہ سب نہیں سوچتے۔ آپ محبت کرنے والوں کو کھاتے میں ہی نہیں لاتے۔ آپ اپنی موت کا انتظار کرتے ہیں تاکہ غموں سے آزاد ہو جائیں، یہ کبھی نہیں سوچتے کہ جن کی زندگی میرے ہونے پہ منحصر ہے، وہ مر بھی تو سکتے ہیں میری کمی کو محسوس کر کے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ رہا تھا جب داؤد نے کہا۔

"تم مجھے خود غرض کہتے ہو، عیسی احمد، مگر خود غرض صرف میں تو نہیں ہوں۔" عیسی کرسی کھینچ کر اس پہ بیٹھ گیا۔

"خود غرض تو ہر شخص ہوتا ہے، عیسی۔ کسی کے لیے زندگی قربان کرنے والے بھی تو اسی لیے خود کو نثار کرتے ہیں کہ وہ "کسی" انہیں اپنی جان سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ محبوب کی بری بھلی بھی تو ہم اسی لیے سنتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں محبوب کے روٹھ جانے سے؟

کوئی بھی اس دنیا میں ایسا نہیں ہے جو خود غرض نہ ہو۔ تم انسانوں کی بات کرتے ہو؟ حالانکہ خود غرض تو جانور بھی ہوتے ہیں۔ خود غرض تو زمین و آسماں بھی ہوتے ہیں۔۔ خود غرض تو یہ پوری دنیا ہے، عیسی۔۔"

اس کے یوں بولنے پہ عیسی اٹھ کر اندر چلا گیا۔۔

ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس جواب نہ تھا، بس وہ چاہتا تھا کہ داؤد کو اپنی غلطی کا احساس خود ہو۔۔

چاہتی تو شاید یہ قدرت بھی تھی، کہ اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا جاتا۔۔

●●●●●

اگست کی ایک حبس زدہ شام وہ ہسپتال کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں عائزہ کا بیٹا تھا۔

"کیسے ہو چیمپئن؟" یہ عالیان کی آواز تھی۔

وہ اسے دیکھ کر چہکا۔

"میں نے آپ کو بہت یاد کیا، بھائی۔۔" وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔

اسے دیکھ کر عالیان کا دل مٹھی میں دبوچا گیا۔

"میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا۔۔ اچھا چلو، جلدی سے بتاؤ کہ تم نے کسی کو تنگ تو نہیں کیا۔" اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا تو عالیان نے اپنی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کے اس کے سامنے کر دی۔

اس نے مسکرا کر چاکلیٹ پکڑ لی۔

"تم نا جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر میں تمہیں ایلیانہ سے ملواؤں گا۔"

"وہ پری؟" علی مسکرایا۔

"جی ہاں، وہ پری۔ جانتے ہو وہ جب ناراض ہوتی ہے تو میں ڈر جاتا ہوں، اور وہ مجھے ڈرا ہوا دیکھ کے رو دیتی ہے۔ وہ بہت نرم دل ہے، وہ معاف کر دیتی ہے، اور بہت پیاری ہے وہ۔ جب وہ مسکراتی ہے تو لگتا ہے، کہ۔۔۔ سارے غم ختم ہو گئے ہیں۔۔" اور پھر مسکراتے ہوئے عالیان خاموش ہو گیا۔

"جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، علی۔ اور ہاں، اب تمہاری سرجری ہو گی، گھبرانا مت، علی۔۔ تھوڑا سا درد ہو گا اور پھر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔ اور پھر میں تمہارے ساتھ فٹ بال بھی کھیلوں گا۔۔"

وہ مسکرانے لگا، اب عالیان اسے الوداع کہہ کر باہر جا رہا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

یہ اس کا معمول تھا، وہ ہر ہفتے کسی نہ کسی دن اس سے ملتا۔

گھنٹوں اس کے ساتھ گزارتا۔۔ اس سے باتیں کرتا، اسے امید دلاتا، قرآن پڑھنا سکھاتا اور واپس آ جاتا۔

جو بھی تھا، اس کے اندر بھی ایک ایسا ہی بچہ چھپا تھا جس نے ماں کو مرتے دیکھا تھا۔

جس نے ماں کے بغیر زندگی گزاری تھی۔●●●●●

دوپہر کے دو بجے اس کا فون بجا، وہ اس وقت ہسپتال میں کامن روم میں بیٹھا تھا۔

"ہو تم خاصے ڈھیٹ، داؤد۔ یہ میری طرف سے آخری بات تھی۔ اب تم میرے اعمال دیکھو گے۔ الٹی گنتی گننی شروع کر دو، داؤد عمر!"

اور داؤد کو یکدم ہوا میں آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

وہ کھینچ کھینچ کے سانس لے رہا تھا۔

پھر ایک لمحے کی دیری کے بعد وہ مسکرا دیا۔

ڈیٹیکٹیو ایس کا میسج تھا۔

"یہ نمبر، جس سے تمہیں کال آئی تھی، ٹریس ہو چکا ہے۔ استعمال کرنے والا راول پنڈی کے پاس موھود ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہے۔ دوسرے نمبر پہ کام جاری ہے۔"

وہ جان چکا تھا وہ شخص کہاں ہے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔

وہ اٹھا تھا، جلدی جلدی میں اپنا لیپ ٹاپ بیگ پکڑا اور باہر کی جانب لپکا۔

وہ فون پہ سینئیر سے کہہ چکا تھا اسے جلد از جلد کہیں پہنچنا ہے۔

اب وہ تقریبا بھاگ رہا تھا، پر بھاگتے بھاگتے وہ تھم گیا، جانے کس خیال کے تحت وہ مڑا تھا۔

وہ اس لڑکی کو ڈھونڈنے لگا تھا۔

اور جب وہ اسے مل گئی، تب وہ مسکرا کر اس کی جانب بڑھا۔

وہ اس کے یوں سامنے آنے پہ حیران ہو گئی۔

"خدا حافظ، ڈاکٹر۔" وہ اس کے عکس کو اپنی آنکھوں میں بھر رہا تھا۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔۔" وہ یوں کہہ رہا تھا گویا مرنے جا رہا ہو۔

ماریہ کے ابرو سکڑے۔

"کیا آپ یہ جاب چھوڑ رہے ہیں؟" اس نے اس کی بات کو مذاق سمجھنا چاہا۔

"نہیں۔۔ ہر بعض اوقات قسمت اگلی ملاقات کا موقع نہیں دیا کرتی۔۔" اس کی بات کو ماریہ چاہ کر بھی غیر سنجیدہ نہیں سمجھ پائی۔

"اگر ہم کبھی نہ ملے۔۔" ماریہ نے اسے روکنا چاہا۔

یہ کہنا چاہا کہ وہ یہ سننے کی سکت نہیں رکھتی۔

اس سے یہ التجا کرنی چاہی کہ یہ نہ کہے کہ اگر وہ نہ ملے۔

پر وہ کہہ رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

"تو میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ جانتی ہوں کہ پہلی ملاقات سے لے کر اب تک آپ مجھے فقط "مسیحا" لگتی ہیں۔" وہ زخمی سا مسکرایا۔

ماریہ کا دل کسی شکنجے میں جکڑا گیا۔

"میں خوش قسمت ہوں جو آپ سے ملا۔۔" یہ کہہ کر وہ مڑ گیا، چلے جانے کے لیے۔

اس لڑکی کی آنکھوں کے گرد آگ بھڑکنے لگی۔ اس کا دل ڈوب کے ابھرا تھا۔

تو کیا، کیا وہ واقعی اس سے پھر نہیں مل سکے گی؟

خیال ہی جان لیوا تھا، اسے اپنا سانس تھمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دوسری جانب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے داؤد عمر نے میسج کیا تھا، اپنے ماموں کو۔

"میں آپ کی محبت کا حق ادا نہیں کر سکتا، ماموں۔ آپ نے مجھے تب محبت دی جب مجھ سے میرا ہر رشتہ چھین لیا گیا تھا۔ میں کبھی کہتا نہیں ہوں مگر۔۔ آپ نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا، ماموں؟" اس کی آواز رندھ گئی۔

اسے مشکل لگا، اپنوں کو الوداع کہنا۔

تب جب معلوم ہو، کہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔

اب وہ عالیان اور عیسی کو گروپ کال کر رہا تھا۔

خوش قسمتی سے دونوں نے کال اٹھالی۔

"خیریت، اس وقت کال؟" یہ چہکتی ہوئی آواز ہمارے خوبصورت شہزادے کی تھی۔

"داؤد عمر وقت دیکھ کے کہاں چلتا ہے، عیسی؟" عالیان کی آواز گونجی۔

داؤد پورے دل سے مسکرایا۔

"میں بس تم لوگوں کی آواز سننا چاہتا تھا۔۔" اس کی بات پہ دونوں ٹھٹھکے۔

"بھائی؟ کچھ ایسا مت کیجیے گا جو آپ کی خود غرضی پہ مہر لگا دے۔۔" یہ عیسی کی آواز تھی۔ تنبیہی لہجہ! آہ۔

وہ اسے کیسے بتاتا کہ اب بہت دیر ہو چکی تھی؟

"داؤد، تم کہاں ہو؟" پریشان سی آواز عالیان کی تھی۔

"ہسپتال، اور کہاں ہونا ہے۔۔ بندہ عام لوگوں کی طرح بات کرے تو تم لوگوں کو فکر لاحق ہو جاتی ہے، نہ کرے تو شکوے رتے رہتے ہو۔۔ حد کرتے ہو تم دونوں بھی۔۔" اس کے شاکی لہجے پر وہ دونوں ہنس دیے۔

"اچھا سنو!" داؤد کی انکھیں نم پڑ رہی تھیں۔

"تم لوگ بھائی ہو میرے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم دونوں میرے لیے بہت اہم ہو۔ اور یہ بھی کہ داؤد عمر تم دونوں سے ہی بہت محبت کرتا ہے!" اظہار مشکل تھا، اس کے دل نے اقرار کیا تھا۔

"اچھا چلو، مجھے جانا ہے اب۔" ان کے سوالوں کو نظر انداز کرتا، وہ فون بند کر چکا تھا۔

●●●●●

کتھئی آنکھیں کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔

وہ پرندے کو پھر پھراتا دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

"میں اکثر سوچتی تھی، کہ انسان محبت کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ میں محبت کو مانتے مانتے کب اس سے

ڈرنے لگ گئی، پتا ہی نہیں چلا۔۔" اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔

سامنے اس کا بھائی بیٹھا تھا، اس کا سب سے بڑا رازدان۔

"میں محبت کی غلام بن گئی۔ میں محبت کی بھیک مانگنے لگی۔ میں نے سب قربان کر دیا، محبت کی خاطر، حتی کہ اپنی ذات کا وقار بھی۔ اور پھر ایک انسان نے میری محبت پہ تھوک دیا۔ اس نے میری ذات کا تمسخر اڑایا۔ اس نے مجھے مکمل طور پر توڑ دیا۔ آج میں اس کی مشکور ہوں۔۔ کیوں کہ اس نے مجھے بتایا کہ میں محبت کو غلط جگہ پہ ڈھونڈ رہی تھی۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

"اس نے مجھے بتایا کہ انسان اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے قدموں کی دھول بنا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ انسان سے انسان مانگو یا محبت، ہاتھ صرف تذلیل آتی ہے۔۔ اس نے مجھے طلاق دی تو لگا زندگی ختم ہو گئی ہے۔" وہ رکی، اس کے بھائی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی، اب اس نے بات جاری کی۔

"پر یہی تو اصل بات ہے، بھائی۔ ہم جب تک موت کو نہیں دیکھتے، تب تک ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔ ہم جب تک نفرت نہیں دیکھتے، محبت کو پہچان ہی نہیں پاتے۔۔" آنکھیں پھر نم پڑنے لگیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"میں نے نفرت دیکھی تاکہ حقیقی محبت کا فلسفہ جان سکوں۔ میں نے زخم کھائے تاکہ مرہم تک پہنچ سکوں۔۔"

"پھر مرہم ملا؟" لڑکے کے سوال پہ وہ مسکرائی۔

"ملا ہر جواب ملا، شفا ملی، دوا ملی، محبت ملی، سب ملا، بھائی۔۔ اس نے چھوڑ دیا تو میں نے جانا کہ مجھے محبت کی ضرورت تھی، مگر انسانوں کی محبت کی نہیں، خدا کی محبت کی۔۔

میں نے زخموں کا مرہم ڈھونڈنا چاہا تو مجھے وہ راہ مل گئی جس میں صرف اور صرف شفا ہے۔"

مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میرے غم مجھے خدا کے قریب لے گئے۔ میرے زخم میری ہدایت کا ذریعہ بن گئے۔ پھر میں غم کی رسی کو برا کیسے کہہ دوں، بھائی؟" اس کے مسکرا کے پوچھنے پہ احسن بھی مسکرا دیا۔۔

کھڑکی کے پار، اب سورج ڈھلنے لگا تھا۔

●●●●●

اس نے خواب میں دیکھا۔۔

کسی خوبصورت منظر کو تکتی اپنی آنکھوں کو۔۔

اور اسے حیران کر دیا، ان آنکھوں کی ویرانی نے۔

وہ کسی جھیل کے کنارے کھڑی تھی، وہ کسی سے مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔

اس نے اپنی مسکراہٹ کو مٹتے دیکھا۔

اس نے خود کو صحراؤں میں بھٹکتے دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ گر گئی ہے، اونچے مقاموں سے۔

اس نے زندگی کو مرتے دیکھا۔

وہ سہم گئی، وہ اس خواب سے جلد از جلد جاگنا چاہتی تھی۔

پر ہر بار زندگی ہماری تابع کہاں رہتی ہے؟

●●●●●

عید پہ احمد اور ہادی کی بات ہو گئی تھی کہ وہ اگلے سال کے شروع ہوتے ہی رخصتی اور ولیمہ کر لیں گے۔

یہ دسمبر کی ایک سرد دوپہر تھی، جب وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ اس وقت شہر لاہور کی سڑکوں پہ مٹر گشتی کر رہے تھے۔

"ویسے ابھی تو نہ رخصتی ہوئی ہے نہ ولیمہ، اور تم ابھی سے میرے پھول لانا بھول گئے ہو، عالیان۔۔" اس

نے بچوں کی طرح منہ بنا کر شکوہ کیا تو وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"آج تم سے ملنے کی جلدی ہی اتنی تھی، شکر کرو میں خود کو نہیں بھول گیا۔" اس نے بھی برابری کرتے ہوئے بچوں کی طرح ہی جواب دیا۔

اس نے اس کا ہاتھ تھاما، اور دھیمے سے مسکرا کر کہا۔

"چلو پھر، پہلے تمہارے سفید گلاب ہی لے لیتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا، اور ایک موڑ کاٹ کر تھوڑا آگے جا کر گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔

سڑک کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی پھولوں کی دکان تھی۔

اس نے دروازہ کھولا، تو ایلیانہ بھی باہر نکل آئی۔

"اب آ ہی گئی ہوں، تو تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی، ایک پل ے لیے بھی۔" وہ بھی آج شرارت کے موڈ میں تھی۔

"جیسا آپ چاہیں، راج کماری۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اب وہ دونوں سڑک کے پار جا رہے تھے۔

آج سڑک پار کرتے ہوئے ایلیانہ احمد کو کسی شے کا بھی خوف نہیں تھا۔

کیوں کہ اس نے اس شخص کا ہاتھ تھام رکھا تھا جو اسے گرنے دے سکتا ہی نہیں تھا۔

وہ جانتی تھی کہ جب وہ اس شخص کے ساتھ ہوتی تھی تو مصیبتیں اس سے کوسوں دور ہوتی تھیں۔

اسے اس شخص کے ساتھ پہ ناز تھا۔

وہ شخص اس کا انعام تھا۔

اس کی تمام مسکراہٹوں پہ اس کا حق تھا۔

اس ایک شخص کا ہونا اعزاز تھا۔

اب وہ دونوں پھولوں کی دکان پہ کھڑے تھے۔

جب عالیان نے اسے اپنی مرضی کے پھول چن لینے کو کہا تو وہ دلکشی سے مسکرائی اور پھر ہولے سے کہا۔

"میری تمام خوشیاں چننے کے حق میں تمہیں دے چکی ہوں، مسٹر۔ اور ویسے بھی تم جب خود یہ گلدستہ بناؤ گے تو ہر پھول اور خاص ہو جائے گا۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ تم نے پوری بات کہی ہے۔" آنا نے ابرو اچکائے گویا سوال کیا ہو کہ پوری بات کیا ہے۔

"جب میں کسی خاص کے لیے اپنے ہاتھوں سے گلدستہ بناؤں گا نا، تب ہر پھول اور خاص ہو جائے گا۔"

اب عالیان ہاتھ بڑھا کر پھول لینے لگا، تو ایلیانہ نے گھوتے ہوئے کہا۔

"بنا اجازت کے ہاتھ نہیں لگاتے۔" وہ مسکرایا اور پھول چنتا گیا۔

اس کے مسکرانے کی وجہ آنا کو تب معلوم ہوئی جب دکان کا مالک آکر اس سے سلام دعا کرنے لگا۔

"تو آپ ہیں وہ خوش نصیب؟" آنا نے سر جھکا کے سلام کیا۔

آنا کے نہ سمجھنے پہ عالیان نے بتایا۔

"تمہیں یاد ہے جب تم مجھ سے ناراض تھی۔ جب میں تم سے ملا نہیں تھا کافی عرصے تک۔۔" آنا زیر لب مسکرائی۔

تو یہ طے تھا کہ وہ نہیں مانے گا، کہ وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

"تب میں بہت پریشان تھا کہ تمہیں کیسے مناؤں، تب میں نے پہلی بار یہاں آکر پھول چنے تھے، اور تمارے لیے گلدستہ بنایا تھا۔۔" آنا کو اپنی آنکھیں نم پڑتی محسوس ہوئیں۔

اب اسے سمجھ آیا کہ کس وجہ سے اسے معمولی سے سفید گلاب اتنے غیر معمولی اور خاص لگا کرتے تھے؟

وہ اس شخص کی محبت تھی جو ہر عام شے کو خاص کر دیتی تھی!

وہ محبت کا اثر تھا کہ اسے سوکھے ہوئے پھولوں سے بھی خوشبو آیا کرتی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ اس کی چاہت ہی تو تھی کہ ایلیانہ احمد کا دل چاہتا تھا کہ ان پھولوں کو سنبھال کر رکھے۔

کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے پہ ایلیانہ احمد کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ عالیان اور اس بوڑھے شخص میں خاصی شناسائی تھی۔

اب وہ پھول چن چکا تھا۔ وہ ایک کونے کی طرف جا کر بیٹھ گیا اور ان پھولوں سے کانٹے کاٹنے لگا۔

آنا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"میں تم سے ایک بات پوچھوں۔۔" اس نے بچوں کے سے انداز میں، آنکھیں پوری کھول کر پوچھا۔

وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی تو بچی سی بن جاتی تھی۔

"ایک کے کے بجائے سو پوچھ لو، میری جان۔" اور شاید وہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ کسی کے طرزِ تخاطب پہ اس کا چہرہ لال پڑ گیا تھا۔

وہ پورے دل سے مسکرائی تھی۔

"اتنے پھولوں میں سے، سفید گلاب ہی کیوں؟"

وہ اس سوال پہ تھم سا گیا، ذہن کے پردوں پہ کوئی منظر لہرایا تھا۔

(آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور آنکھوں میں شدید پشیمانی لیے، وہ لاہور کی اس سڑک پہ ہی کھڑا تھا۔

یہ سال کا سرد ترین مہینہ تھا۔ اور وہ شخص اس ٹھنڈک کا اثر ہی نہیں لے رہا تھا۔

"اداس لگتے ہو؟" اس نے بدک کر پیچھے دیکھا۔

جہاں کتھئی آنکھوں والا بوڑھا شخص اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔

"جی۔۔" اس نے روکھا سا جواب دیا۔

"مجھے اس سڑک پہ دکان چلاتے چالیس سال ہو گئے ہیں۔۔ ان چالیس سالوں میں، میں نے اتنے انسانوں اور اتنے جذبوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے کہ اب کوئی احساس انجان لگتا ہی نہیں۔" عالیان کو سمجھ ہی نہیں آیا

کہ وہ کیا کہے، سو اس نے خاموشی پہ اکتفا کیا۔

"تم پشیمان ہو۔ کسی کو پانا چاہتے ہو۔ کسی کو منانا چاہتے ہو؟" آخری بات انہوں نے استفہامیہ انداز میں کی۔

اس نے فوراً ان کی طرف دیکھا۔ اور ہاں میں سر ہلا دیا۔

"خلوص کے ساتھ ادا کیے گئے ہر لفظ میں بے انتہا طاقت ہوتی ہے۔ تمہیں کیوں لگتا ہے کہ تم سچے دل سے معافی مانگو گے اور کوئی مانے گا نہیں۔۔"

ان کی بات کا اس پہ خاصا اثر ہوا تھا۔

"ان میں سے کوئی بھی پھول لے جاؤ۔" وہ ایسے تحکم سے بولے تھے کہ وہ فوراً پھول دیکھنے لگا۔

سرخ گلاب، موتیا، چمپا، گلِ لالہ۔ اور انہیں دیکھ کر وہ تھم گیا۔

سفید خوبصورت گلاب، جنہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے کسی جھیل کی مانند گہری، سبز آنکھیں آ گئی تھیں۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

وہ پھول اسی کی طرح خالص، حسین اور گہرے تھے۔

اسے ان پھولوں کو دیکھ کر محض "محبت" یاد آئی تھی۔)

اب وہ مسکرایا۔ اس دلکشی سے کہ ایلیانہ احمد اس کے چہرے پہ نگاہیں نہیں ٹکا سکی۔

"یہ پھول بالکل تمہاری آنکھوں کی طرح ہیں۔۔" اس کے سادگی سے کہنے پہ وہ اچانک بولی۔

"یعنی حسین؟"

"یعنی خود میں کئی راز اور گہرائے چھپائے ہوئے، یعنی دل موہ لینے کی صلاحیت رکھنے والے، یعنی زندگی بخشنے والے۔۔ یعنی۔۔" اور وہ رکا، اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس طلسم کے زیرِ اثر دونوں نے ساتھ ہی کہا۔

"یعنی محض محبت!"

دونوں نے نظریں جھکا لیں۔

وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیر تک جھانک لیتے تو ڈوب نہ جاتے؟

اور ڈوب جاتے تو دنیا کے کہاں رہتے؟

یکدم وہ چہکی تھی، آسمان پہ بادل چھا رہے تھے۔

"بارش ہونے والی ہے!" وہ پورے دل سے مسکرائی۔

عالیان نے بادلوں کو دیکھا اور پھر اس کی طرف، اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

ایک حسین مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کیا، ہونٹ پھر پھرائے اور وہ لفظ اس کی زباں سے ادا ہو کر ایلیانہ احمد کے دل تک پہنچ گئے۔

"یہ دنیا حسین ہے، یا تمہارے ساتھ لگ رہی ہے؟"

(گاڑی چلاتے ہوئے داؤد عمر نے ای میل کھول کے دیکھی تو وہ گاڑی روکنے پہ مجبور ہو گیا۔

ڈیٹیکٹیو ایس کی طرف سے ایک ای میل موصول ہوئی تھی، اس نے وہ ای میل کھولی، مگر اس میں کچھ ایسا تھا جس نے اس کی دھڑکن تیز کر دی۔

اس میں لکھا تھا۔

"دونوں نمبر مختلف لوگوں کے ہیں، ایک پنڈی میں ٹریس ہو رہا ہے اور ایک لاہور میں۔۔"

آگے اور بھی کچھ لکھا تھا، "ہو سکتا ہے وہ دھمکیاں نہ ہوں، بلکہ کوڈ ورڈز میں تمہارے لیے کوئی پیغام ہو۔" اس کی بات میں جان تھی۔

یہ داؤد عمر نے پہلے کیسے نہیں سوچا؟)

بادلوں کو اشتیاق سے تکتی لڑکی نے بادلوں کی پکار کو نظر انداز کیا، اور پیچھے مڑ کر اس شخص کو دیکھا، جو مسکراتا تھا تو لگتا تھا کہ دنیا میں فقط خوشی ہے۔

اس کے ایک ہاتھ میں دو پھول تھے، ایک میں کینچی، ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے تھے اور سرمئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اس منظر پہ اس کا حق تھا۔

اس حسین شخص پہ اس کا حق تھا۔

یہ منظر اس کے ذہن نے قید کر لیا، قید تو خیر آسمان پہ چھائے بادلوں نے بھی کر لیا تھا۔

دور سے دیکھو تو وہ سنگ مرمر کے مجسمے دکھتے تھے۔

وہ ساتھ ہوتے تھے تو مکمل لگتے تھے۔

کبھی تنہا ایک مجسمے کو دیکھو تو فوراً سمجھ جاؤ کہ ایک کے بن دوجا ادھورا ہے۔

ان دونوں نے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ لمحہ الفاظ کی قید سے ماورا تھا۔

پھر اس بارش کی عاشق نے اس منظر کو قربان کیا اور اس شخص کے ساتھ جا بیٹھی، جسے وہ سکون کہتی تو غلط نہ کرتی۔

اس نے اس کے کندھے پہ سر ٹکا دیا، اور اس نے ایک بار بھی اف نہیں کیا، بلکہ اس ہاتھ کو جتنا ممکن تھا اتنی کم حرکت دی۔

کچھ دیر بعد ایلیانہ احمد نے اسے گلدستہ بناتے دیکھا، وہ اتنے انہماک سے گلدستہ بنا رہا تھا، اتنی توجہ سے اس

کے لیے ان پھولوں کو سجا رہا تھا، کہ اسے اس کی ہر حرکت سے محبت ہو گئی۔

اس نے گلدستے سے ایک پھول اٹھایا، اور پھر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

عالیان نے مزاحمت نہیں کی نہ ہی یہ کہا کہ وہ اسے پریشان کر رہی ہے۔

اس نے اس کے ہاتھ پہ سر ٹکا دیا۔

اب یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔

کچھ دیر سر ٹکائے رکھنے کے بعد اس نے اس کے ہاتھ کی پشت پہ بوسہ دیا۔

اور پھر اس کے ہاتھ پہ انگوٹھا مسلنے لگی۔

عالیان نے اپنے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس نامکمل گلدستے کو۔

پھر نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ الگ گیا۔ وہ مسکراتی رہی۔ یعنی اسے برا نہیں لگا تھا۔

(داؤد نے وہ تمام میسج کھولے اور انہیں غور سے دیکھنا شروع کیا، کچھ دیر وہ یوں ہی سر کھپاتا رہا، مگر پھر اس نے دیکھا، تو اس کا پیغام تو اتنا واضح تھا۔

داؤد کو اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں جو لکھا تھا، وہ اسے قتل کیے بنا اسے مارنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اسے محسوس ہوا گویا اس کے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔)

پانچ منٹ بعد وہ گلدستہ اس کے ہاتھ میں دے رہا تھا، اور آنا نے اپنے ہاتھ میں موجود پھول اس کے آگے کر دیا، وہ سر جھکا کر ہنس دیا۔

پھر اس پھول کو تھاما، بہت احتیاط سے اس کی پتیوں کو چھوا، اس پھول کو محسوس کیا۔

آنکھوں میں ڈھیر سارا تشکر لیے وہ اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

اب وہ اپنے "صدیقی انکل" کو پیسے دے رہا تھا۔ پھر وہ دونوں سڑک پار کرنے لگے۔

اور ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھامے ہوئے، وہ دونوں ہی اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے معجزہ تھے۔

وہ ایک دوسرے کا انعام تھے۔

سرمئی اور سبز آنکھوں نے ایک دوسرے میں جھانکا۔

وہ بن بولے باتیں کرنے لگیں۔

وہ لمحہ زندگی تھا!

بادل گرجے، ایلیانہ احمد نے آسمان کو دیکھا اور یکدم اسے اپنا جسم سن پڑتا محسوس ہوا۔

وہ محسوس کر سکتی تھی۔۔ وہ جان چکی تھی کہ یہ عام بارش نہیں تھی۔

وہ بادلوں کی پکار سن چکی تھی، اور سمجھنا وہ چاہ نہیں رہی تھی کیوں کہ۔۔

عالیان اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ اس سے پوچھ رہا تھا، وجہ اس کے اچانک سہم جانے کی۔ مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی، وہ دوسری سمت بادلوں کو گھور رہی تھی۔

اس نے لب کھولے،

مگر تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ زندگی ہر بار ہی جواب کہنے یا سننے کی مہلت دیتی ہے۔

فضا میں بندوق چلنے کی آواز گونجی تھی۔ اس کی آسمان کو تکتی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

جس خاموشی کو اس آواز نے چیڑا تھا، واپس سے چھا چکی تھی۔

اس کا رنگ زرد پڑ رہا تھا، اور اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

کئی سال قبل کسی نے اسے بتایا تھا، کہ اسے الہام ہوا کرتا ہے۔

کئی سال بعد کون جانتا تھا کہ اسے اپنی موت کا الہام بھی پہلے ہی ہو جائے گا۔

اس کی قوتوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

اسے عادتیں ہمیشہ سے ڈراتی تھیں۔

اس کی عادت نے اسے مار ڈالا۔۔

زندگی نے دغا کی تھی، عین اس لمحے جب اسے جینا تھا۔

اس نے اپنے ارد گرد اٹھتا شور سنا۔

اس نے لب ہلانے چاہے۔ اس نے زندگی کو پکارنا چاہا، مگر اس میں اتنی طاقت کہاں تھی؟

موت نے اس کے الفاظ چھین لیے۔

سانس تھم گیا تھا۔

اگر کوئی اس سے اس لمحے پوچھ لیتا کہ دنیا کا سب سے مشکل کام کیا ہے، تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کہتی "مڑ کے دیکھنا، اس وقت جب معلوم ہو کے مڑ کے دیکھ لیا تو مر جاؤ گے۔"

اس نے اتنا عرصہ ہر شے کی پکار کو نظر انداز کیا تھا، کیوں کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ جان لیا تو "**جان**" جائے گی!

اب گرجتے بادل برسنے لگے تھے۔ یا شاید وہ رو رہے تھے۔ اس کے غم میں، اس سے پہلے۔

اور گلوگیر فضا ایک ہی نغمہ گا رہی تھی۔

"اک لڑکی، ہنستی مسکراتی

آنکھیں اس کی زندہ جھیل

باتیں اس کی روشن چاند

ہنسی پہ اس کی دنیا قربان
دل اس کا پانی جیسا پاک
اک لڑکی نام تھا جس کا زندگی

اک لڑکا، اکھڑ مزاج
آنکھیں اس کی سنجیدگی کا عکاس
باتیں اس کی تلخ حقیقت
جس میں ہے ہنسی کا قبرستان
دل جس کا تھا پتھر کی مانند
اک لڑکا نام تھا جس کا موت

پھر قدرت نے اک کھیل رچایا
زندگی کے نرم دل نے موت کو اپنایا
ہاں ہوئی تھی اس ہنسی کو غم سے محبت
ہاں چن لیا تھا اس نرم دل نے اپنا پتھر

اب دیکھو تم ان آنکھوں کو
گہری جھیلیں سوکھ چکی ہیں
روشن باتیں بجھ گئی ہیں
جس ہنسی پہ مرتی تھی دنیا

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ ہنسی تو کب کی مر چکی ہے
جو دل تھا پانی سے زیادہ پاک
اب وہ ٹکروں میں بٹ چکا ہے
آنکھوں میں ہیں اب فقط لاشیں
قتل ہو چکا ہے مسکان کا
روشن سورج ڈوب چکے ہیں
اور سایہ پھیلا ہے رات کا
خوشیوں نے خنجر گھونپ دیا ہے
اور اب بچے ہیں مخلص غم

اور غم کی ذرا روداد تو سنو
ذرا تم بھی کرب کی بات سنو
آہیں چلا کر کہہ رہی ہیں
آنسو چیخ کر بتا رہے ہیں کہ

محبت پھولوں کو دیتی ہے توڑ، جانم
محبت پرندوں کو کر دیتی ہے قید، جانم
محبت جلا دیتی ہے پروانے کو
محبت زندگی کو دیتی ہے موت، جانم

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اور محبت ہے کیا؟

محبت درد ہے جانم

محبت کرب ہے جانم

محبت ہے کسی کا سخت دل

محبت ہے ہنسی کا گور

محبت ہے اک تلخ حقیقت

محبت ہے سنجیدگی کا عکاس

لیکن محبت ہے کون؟

محبت روگ ہے، جانم

محبت خوف ہے، جانم

محبت موت ہے، بس موت ہے، فقط موت ہے جانم!"

●●●●●

(اگلی قسط اکتوبر میں، انشاءاللہ)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

safareadab.com

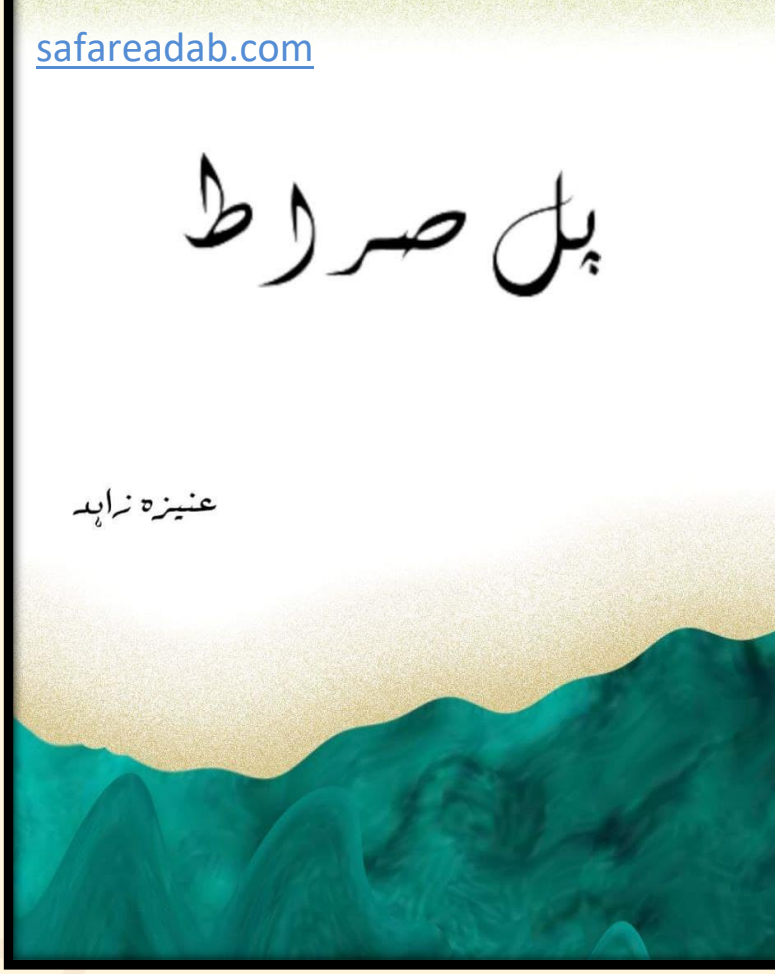

"تم مجھے ایک برا انسان سمجھتی ہو نا۔ مجھے پہچاننے میں تم سے ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میں صرف برا نہیں، ایک بدترین انسان ہوں۔" وہ گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔ شراب گلاس سے باہر گرنے لگی تھی پر اسے تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے وہ گلاس اٹھایا اور اسکی طرف دیکھا۔

وہ خوف سے اپنی جگہ پر سمٹی۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ اس وقت تمہارا کوئی موڈ نہیں ہے مجھ جیسے شرابی کے منہ لگنے کا؟" وہ خود سے سوال کرتا، خود سے جواب دیتا اس کے قریب بیٹھا۔ "اور یہ کہ میں نشئی ہوں؟ آج تمہیں بھی شراب کی لذت چکھاؤں گا۔" اس نے گلاس منال کے منہ کے قریب کیا۔

☆☆☆

'کبھی تو تو بھی محبت کرے گا۔'

فاران احمد نے محبت کی تھی!

'تو بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہے گا۔۔'

اس نے بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور پھر۔۔ پھر وہ تجھے چھوڑ جائے گی۔'

اور پھر وہ اسے توڑ گئی۔

'پھر میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور کہوں گا کہ دل پہ مت لے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا، کوئی اور آ جائے گی۔'

اسکے جانے کے بعد کوئی نہیں آیا۔ اس نے آنے ہی نہ دیا۔

safareadab.com

"یہاں دستخط کرو غازہ ! "کاغذ غازہ کے سامنے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو غازہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے اس اجنبی شخص کو دیکھا جس سے ابھی وہ چند گھنٹوں پہلے ملی تھی۔ ان چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس شخص کو اس کا مختار بنا ڈالا تھا۔ زندگی میں پہلی بار قلم پکڑتے ہوئے غازہ کے ہاتھ بُری طرح کانپے تھے۔ وہ تو باآسانی قلم تھام کر شفاف کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر بہت سارے خاکے بنا لیا کرتی تھی، کچھ دھندلے ہوتے تو کچھ میں پہلی ہی جست میں جان موجود ہوتی۔

"تم رشتے کھونے سے ڈرتی ہو غازہ ! "سبیکہ کا چند روز قبل کہا گیا جملہ کان کے پردے پر ابھرا تھا۔

"سچ کہا تھا تم نے میں رشتے کھونے سے ڈرتی ہوں سبیکہ ! اور یہ نیا ادھورا رشتہ بھی شاید میں کھونے کے لیے ہی بنا رہی ہوں۔" دل میں اس کے کہے کا جواب دے کر اس نے کاغذ پر قلم گھسیٹا تھا۔ عجیب بات تھی وہ ایک کاروباری شادی کے لیے دلہن بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری زندگی برباد کر کے تم یہاں سکون سے سو رہی ہو۔ شام سے مینو مجھے فون کر رہی ہے اور میں اس کا فون نہیں اٹھا رہا جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں اس سے بے وفائی کرنے پر بے حد شرمندہ ہوں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو چاہا ہے اور تم زبردستی ایک بزنس ڈیل کی طرح میرے سر پر آ گئی ہو۔" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا اپنے اندر کا سارا انتشار اس پر انڈیل رہا تھا۔ غازہ خاموشی سے بس اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے واقعی ہی اس شخص پر ترس آیا تھا جس کی محبت آباد ہونے سے پہلے ہی اس کے باپ نے اجاڑ دی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"میں بہت تلخ ہو چکی ہوں کلیج ! جانتے ہو کیوں؟" اس نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انتہائی آہستگی سے کہا تھا۔

"کیونکہ اس دنیا اور معاشرے کی سفاکی آپ کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اول تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے کمیٹڈ ہو اور بالفرض اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو تب بھی میں وہاں کچھ نہیں کر پاتی۔ میں یہ کاغذی تعلق تب بھی نہیں روک سکتی تھی۔ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں کلیج ارسلان ! بلکہ اپنے مجرم تم خود ہو۔ مینو کے مجرم تم ہو جو محض اپنے باپ کی لالچ کے ہاتھوں اپنی محبت پر ایک کاغذی سوتن لے آیا۔" وہ سینے پر بازو لپیٹے انتہائی تلخی سے کہہ رہی تھی جبکہ کلیج بس حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو میرے لیے اب محبت کیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو بمشکل روکے ہوئے تھی۔ "م جس سے (ال) مالک شروع ہوتا ہے، ح جس سے (ال) حلیم شروع ہوتا ہے، ب جس سے (ال) باری اور ت سے تمنا (وہ جو اللہ سے کی جاتی ہے) شروع ہوتی ہے۔۔ بس یہی ہے میرے نزدیک محبت!" وہ ضبط کی انتہا پہ تھی۔ "ایک وقت تھا تم میری تمنا تھے مگر اب صرف ایک ہی تمنا ہے میری۔۔۔ اللہ۔۔۔ بس اللہ۔۔۔!" وہ رکی اور گہرا سانس لے کر بولی۔ "ایک بار بھابھی نے کہا تھا کہ ایک بار جو چڑھ جائے رنگِ حبِّ الٰہی تو اترتا نہیں۔۔۔! ہاں وہی رنگ چڑھ گیا ہے مجھے۔" وہ زید کی خاموشی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اب ایک آخری جملہ رہ گیا تھا کہنے کو۔ وہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی کہ زید بولا۔ "تمنا تمہیں نہیں بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا تھا، اور تمہارا ہی رہوں گا۔ شوہر کی تمنا بھی ہوتی ہے بھلا کسی کو۔" وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوہر کے غیر محرم ہونے میں بس ایک دستخط کی دیر ہوتی ہے۔" وہ سنگدل ہو چکی تھی۔ دوسری جانب زید کو دھچکا لگا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سننے میں آیا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" اسے جھٹکا لگا کیا وہ جان گئے تھے۔ وہ ذرا بوکھلا گئی مگر جھوٹ وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"جی، مگر آپ سے کس نے کہا؟" اس نے لکھ ہی دیا۔

"وہ اہم نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" وہ کچھ مزید بوکھلائی۔ اب کیا کرے؟

"میں نہیں بتا رہی۔ ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ میں ایسے تو نام نہیں بتا سکتی نا؟" اسے یہی جواب ٹھیک لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ یہ تاثر دے گی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس نے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ اب جھوٹ ہے تو جھوٹ سہی۔ شرم سے تو بچ جائے گی نا۔

"ویسے تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔" وہ گھبراہٹ میں پگھل رہی تھی جلتی موم کی طرح۔

اچھا اتنے پُر یقین ہیں تو بتائیں نام؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ٹائپ کیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ہی پسند کرتی ہو، آئمہ۔" وہ دم بخود رہ گئی۔ آخر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ ور اگر وہ جانتے تھے تو کب سے جانتے تھے؟ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

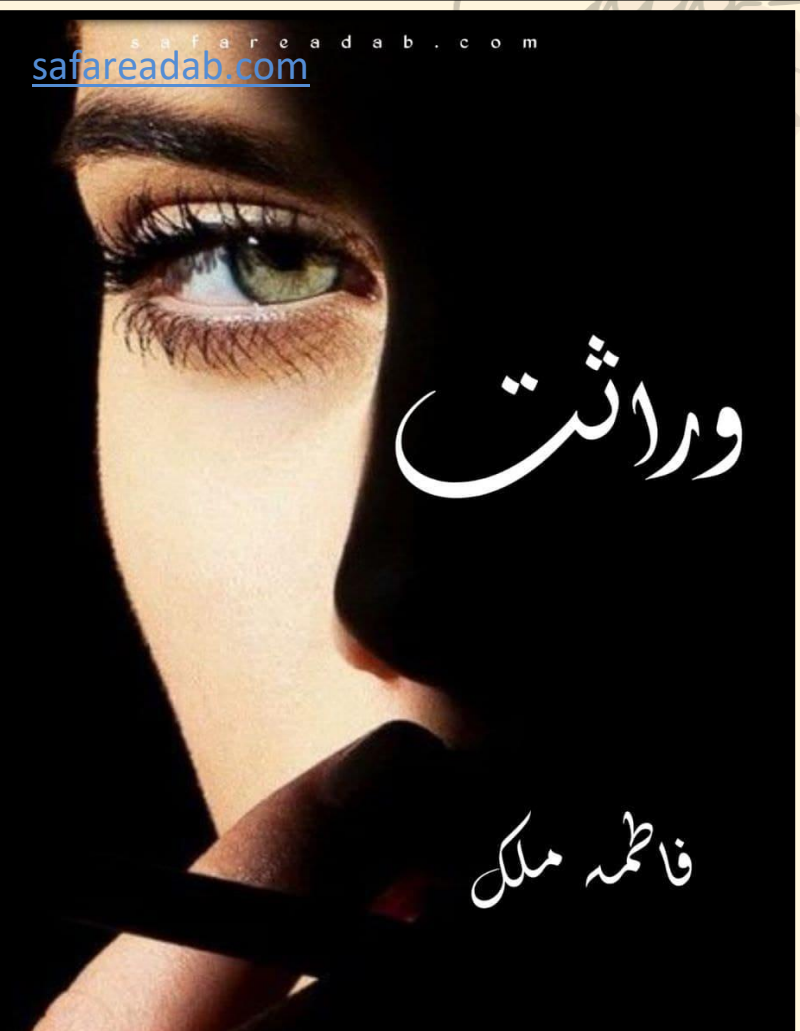

"اگر تمہاری مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں موقع ملتا تو کیا تم حسن خان کو اپنا لیتی؟"

رقیہ الجھ سی گئی۔ "میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔"

وارث جان نے بہت سوچنے کے بعد سوال کا انداز بدل دیا۔ "تمہیں مجھ میں یا حسن خان میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو کسے چنو گی؟"

رقیہ وارث کے اس سوال پر ناراض ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔ یہ کیسا عجیب سا سوال ہے۔۔ آپ شوہر ہیں میرے اور وہ کوئی نہیں میرا۔ بس ساتھ پڑھتا ہے اور اچھا کلاس فیلو ہے۔ اس کا آپ سے کیا مقابلہ بھلا!!!"

وارث جان ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ "رقیہ میں صرف اور صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حسن خان کے ساتھ کو پا کر خوش رہ سکتی ہو تو۔۔۔" اس کے باقی ماندہ الفاظ اندر کہیں دب کر رہ گئے تھے۔ رقیہ جو وارث جان سے کبھی اونچی آواز میں بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وارث جان کے گال پر زوردار تھپڑ مار دیا۔۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیسے اس کا ہاتھ وارث پر اٹھ گیا۔۔

☆☆☆

"امبر تم نے کہیں رقیہ کو دیکھا ہے۔ مجھے گیٹ سے پتا چلا کہ رقیہ آ چکی ہے۔" رقیہ کی حسن کی طرف بیک تھی۔ رقیہ مسکراتے ہوئے پلٹی اور حسن خان وہیں دل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ "اف۔۔ کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔" اس سے پہلے کہ حسن خان مزید کچھ اور کہتا رقیہ اس کی طرف بڑھی۔ حسن خان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ آج وہ رقیہ کو پا لینے کے جنون سے آیا ہے۔ حسن خان کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہوں نے رقیہ کے لیے تعریفی جملے کچھ اس طرح کہے۔ "بہت خوبصورت ہو تم اور آج تو بہت زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ جانتی ہو آج حسن مجھے کیوں لایا ہے اپنے ساتھ؟؟" ابھی وہ مزید کچھ کہتیں کہ رقیہ نے مسکرا کر حسن کو مخاطب کیا۔

"حسن ان سے ملو میرے ہسبنڈ۔ سردار وارث جان۔" حسن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں وہ بے اختیار بولا "کیا؟؟ کیا کہا ہے تم نے۔۔۔؟؟ کون ہے یہ؟؟۔۔۔ مطلب تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے ان کا؟؟؟"

ی۔۔۔یا۔۔۔ال۔۔۔۔۔ال۔اللہ" اس نے بمشکل لفظوں کو ادا کیا

"می۔ ممی۔۔۔میر۔۔۔میری مدد کر۔۔وہ پھر سے بولی۔اس کو ڈر لگ رہا تھا۔

وہ پھر سے رونے لگی تبھی موبائل کی گھنٹی بجی، یہ آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ایک ان نون نمبر سکرین پر جگمگا رہا تھا، وہ کسی سے بھی بات کرنے کی حالت میں نہ تھی اس لئے اس نے فون نہیں اٹھایا، فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی، اس بار فون اٹھایا تو مقابل کے بولتے ہی عائشہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"عائشہ عائشہ کیا ہوا ہے" دوسری طرف مومنہ کا دل حلق کو آیا کیونکہ وہ پہلے ہی اس کی وجہ سے پریشان تھی، اس لئے تورات کے اس پہر بھی فون کر رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی عائشہ جاگ رہی ہو گی۔

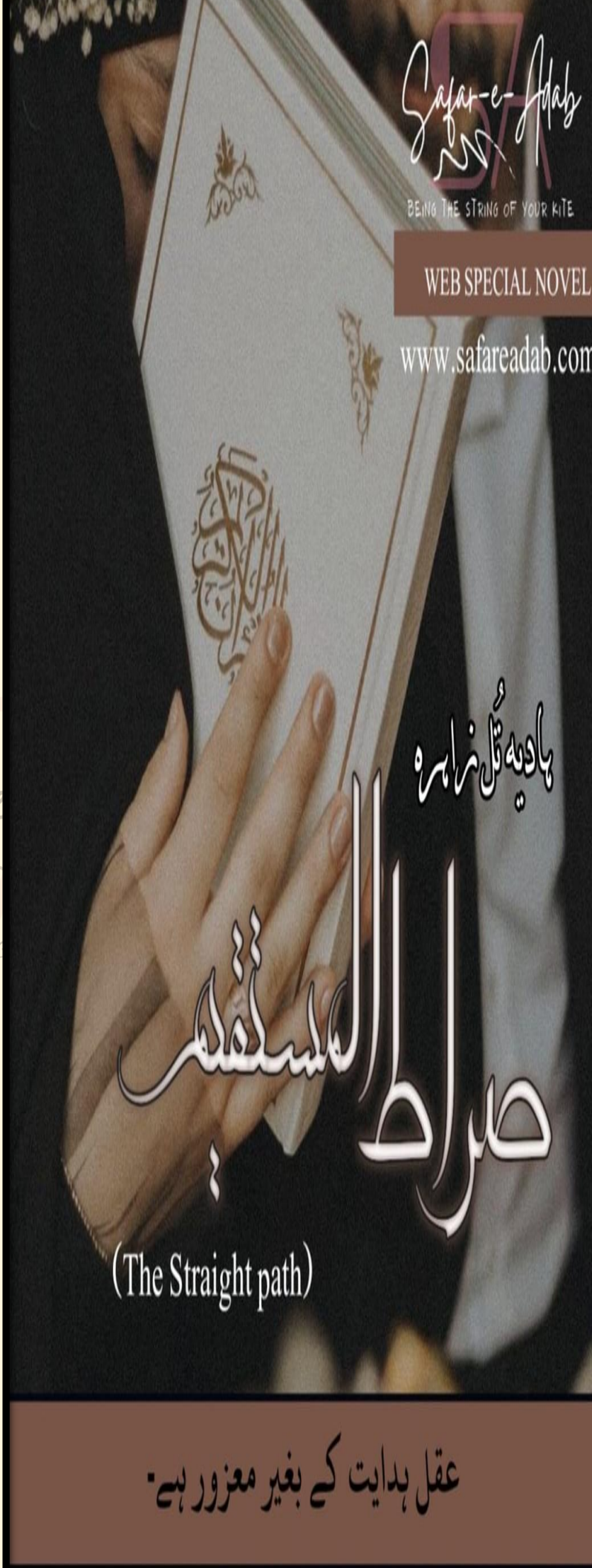

عائشہ بناء کچھ بولے بس رو رہی تھی، مسلسل رو رہی تھی۔

"مم۔۔مومنہ "وہ آگ میں، میں۔۔۔۔۔میرا جسم۔۔۔مومنہ "وہ ٹوٹے لفظوں میں بولنے لگی۔

عائشہ رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے"

"تم واپس آجاؤ۔پلیز۔۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

مکمل ناول فری میں پڑھنے کے لیے یہاں کلک کریں۔

safareadab.com

سفر ادب کی جانب سے ناولوں کی پی ڈی ایف کاپی کو ہر غلطی سے ماورا بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کسی بھی طرح کی غلطی پائی جانے پر اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔ ہماری ٹیم کے تیار شدہ پی ڈی ایف کے تمام جملہ حقوق سفر ادب کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ کسی ادارے یا شخص کی جانب سے ہمارے کام کو اپنے آفیشل استعمال میں لانے کی کوشش کو غیر قانونی سمجھ کر سفر ادب کی جانب سے کاروائی کی جا سکتی ہے۔

- ٹیم سفر ادب